راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

ماہنامہ

# ارژنگ

لاہور

Monthly

# Arxang

Lahore

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

ستمبر 2015ء

## خدا ہر اچھے شاعر کو اس صورت حال سے بچائے کہ وہ اپنے ہی دوستوں کا نشانہ بنے۔

### آج میں جو کچھ ہوں وہ جناب احمد ندیم قاسمی کے سبب سے ہوں۔

### قمر رضا شہزاد سے عامر بن علی کی گفتگو

● شاعری کا خیال کیسے آیا؟

● یہ تو شاید میں واضح نہ کر سکوں کہ کب مجھے شاعری کا خیال آیا۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد ادبی کتابیں دیکھیں۔ میرے والد صاحب ادیب یا شاعر تو نہیں تھے مگر انہیں مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگلش اور اُردو لٹریچر کی کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ جو اب میری لائبریری کا حصہ ہے۔ پڑھنا شروع کیا تو انہی کتابوں سے آغاز ہوا۔ پھر سکول کے زمانے میں میرے ایک اُستاد شوکت حسین مرحوم جو اگرچہ سائنس پڑھاتے تھے مگر ادبی ذوق کے حامل تھے۔ انہیں اساتذہ کے سینکڑوں شعر یاد تھے۔ ہر ہفتے بزمِ ادب کا اجلاس ہوتا تھا جہاں طلباء کے مابین بیت بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ میں ان مقابلوں میں نہایت شوق و ذوق سے شریک ہوتا۔ غالباً یہی وقت تھا جب میں نے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ مقابلے کے دوران جب کسی حرف پر کوئی شعر یاد نہ آتا تو خود ہی شعر گھڑ کر سنا دیا کرتا تھا۔

کالج کے زمانے میں بین الکلیاتی مشاعروں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں طلبا کی اکثریت اُستاد شعراء سے غزلیں اور نظمیں لکھوا کر مشاعروں میں شریک ہوتی تھی۔ جبکہ میں خود بھی غزل یا نظم کہتا تھا۔ اوّل انعام میرے حصے میں شاید اس لیے بھی آتا کہ اکثر طلباء غزلیں اور نظمیں پڑھتے پڑھتے بے وزن کر دیتے تھے جبکہ میں بالکل درست پڑھتا تھا۔ اگرچہ میں علم عروض کا ماہر نہیں ہوں مگر مجھے ایک کمال ضرور حاصل ہے کہ میرا وجدان شعر کے وزن کے

**ادب ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی ترجیحات میں کبھی نہیں رہا۔**

معاملے میں اتنا حساس ہے کہ جب میں شعر نہیں بھی کہتا تھا تو مختلف مقامات پر چھپے ہوئے بے وزن شعر مجھے اذیت میں مبتلا کر دیتے تھے اور میں ان کی اصلاح کر کے انہیں وزن میں کر دیا کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے زمانے تک میرا شاعر بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو ناول نگار یا افسانہ نگار بننا چاہتا تھا۔ مجھے کہانیاں اچھی لگتی تھیں۔ اپنے سکول کے زمانے میں میں نے بچوں کی کہانیاں بھی لکھیں جو بچوں کے رسائل میں شائع بھی ہوئیں۔ مگر بالآخر میرے اندر کے شاعر نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں شاعری کی طرف آ گیا۔

● ادبی سفر کیسا رہا؟

● جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے کہ شاعر ہونا میرے ایجنڈے میں کہیں نہیں تھا لیکن جب شعر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تو پھر ہمہ وقت شاعری میرے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے آبائی شہر کبیروالہ میں اُستاد شاعر بیدل حیدری، خادم رزمی، وفا حجازی اور نور

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 16 واں سال

Monthly
**Arxang**
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
# ارژنگ لاہور

جلد نمبر ۱۷ • ستمبر ۲۰۱۵ء • شمارہ نمبر ۸

مدیر اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

مدیران اعزازی ⊙ ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ تن دیپ تمنا

نائب مدیران ⊙ قمر ریاض ⊙ خالد سجاد
مدیران معاون ⊙ نازاوکاڑوی ⊙ بدر سیماب

مدیر منتظم ⊙ علی رضا

مجلس مشاورت ⊙ احسان شاہد (برطانیہ) ⊙ ظفرا سلام (آسٹریلیا) ⊙ سعدیہ سیٹھی (برطانیہ)

قانونی مشیر ⊙ کامران ناشط : 0300-8800339 سرکولیشن ⊙ شاہد عباسی

ارژنگ دوست ⊙ انیلہ عظمیٰ (امریکہ) ⊙ ارشد شاہین (امریکہ) ⊙ اسعد نقوی (فرانس) ⊙ ارشد ندیم ساحل (چین)

کمپوزنگ ⊙ زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 (ڈیزائنر ⊙ نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ⊙ محمد احسن گل : 0300-4529821

**پتہ برائے خط و کتابت**

**ماہنامہ ارژنگ**

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 نازاوکاڑوی: 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

**سالانہ ممبرشپ**

ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرون ملک 5000 روپے

رابطہ: 0331-4489310 - 0300-4489310

## فہرست

حمد / حسن عباسی ' ۲-۳
نعت / سید ریاض حسین زیدی، عرفانہ امر، قمر ریاض، عبدالرشید ' ۴
طنز و مزاح: کالے انگریز / عطاء الحق قاسمی ' ۵-۶
مضامین: ○ احمد سجاد کی حمد نگاری / خورشید بیگ میلسوی ' ۷-۱۲
○ علی رضا کا "مفہوم" نئے تناظر میں / نبیل صابری ' ۱۳-۱۵
○ لاہور میں چینی ادیب اور شاعر / ڈاکٹر غافر شہزاد ' ۱۶
○ انشائیہ: برقع / غلام مصطفیٰ مغل جی ' ۱۷-۱۸
○ میرے ابو / محمود ظفر اقبال ہاشمی ' ۱۹-۲۴
○ بندر کی انتخابی مہم / پشتون احمد زئی ' ۲۵-۲۶
افسانے:
○ برزخ / حجاب عباسی ' ۲۷-۲۹
○ ہم نفس / صدف زبیری ' ۳۰-۳۲
○ تو پکا دکھا ہے / شازیہ محسن ' ۳۳-۳۶
شعری گوشے: خالد علیم، سید مقبول حسین، عارف فرہاد، محمد بشیر رانجھا، ادریس لاہوری، عیسیٰ بلوچ، ملک عرفان فانی، رفیق کشمیری، کرم علی کیفی، خادم علی انجم ۳۷-۴۹
بقیہ انٹرویو ایم-آر شاہد ' ۵۰-۵۲
متفرق شاعری (غزل) ' ۵۳-۵۸
متفرق شاعری (نظم) ' ۵۹
منتخب اشعار / مرتب: افتخار اشعر ' ۶۰
بقیہ انٹرویو قمر رضا ' ۶۱-۶۳
ادبی خبریں/تقریبات ' ۶۴
تبصرہ کتب/فلیپ آرا ' ۶۵-۷۰
○ نامہ ہائے احباب ' ۷۱-۷۲

**Far East Marketing Co.**

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: fernc1@hotmail.com

# حمد (زیرِ طبع شعری مجموعے "سائیں" سے دوسری حمد)

حسن عباسی/لاہور

تیری جھلک کیا دیکھی سائیں
اپنی ہو گئی چھٹی سائیں
لاکھوں سال سے مکتب میں ہیں
کون بجائے گھنٹی سائیں
تیرے علاوہ کون ہے میرا
تو ہے سب کا بیلی سائیںؐ
مجھ کو جھوٹا کون کہے گا
تیری ذات ہے پکّی سائیں
ایک الف ہی لکھا میں نے
جب بھی تختی لکھی سائیں
تیری جانب ہی کھلتی ہے
ہر اک دل کی کھڑکی سائیں
مجھ کو یک رنگی دکھتی ہے
تیری ہر ست رنگی سائیں
تیری حمد سنی ہے میں نے
جب بھی کوئل بولی سائیں
جیب میں لے کے پھرتا ہوں میں
تیرے نام کی پرچی سائیں
اب تو اپنے پاس بچی ہے
صرف دُعا کی چھتری سائیں
ایک تو مفت اور اتنی میٹھی
تیرے نام کی ٹافی سائیں
ہر اک کام نرالا تیرا
ہر اک بات انوکھی سائیں
خاموشی ہے عرض مکمل
بات مکمل بنتی سائیں
تیرا ہی سامان اُٹھائیں
گُل ہیں قلی سائیں
خود میں حدِ نظر تک دیکھوں
تیری سورج مکھی سائیں
مجھ کو ایک سے آگے اب تو

بھول گئی ہے گنتی سائیں
کِھلا ہوا ہے پھول چنبیلی
کُھلی کتاب ہے تتلی سائیں
بچی کے معصوم لبوں پر
دیکھی تیری سُرخی سائیں
کون سے کام لگا رکھی ہے
تو نے ہر اک چیونٹی سائیں
تجھ سے لگی ہوئی ہے شاید
جالا بنتی مکڑی سائیں
تیری ذات کی تیرے علاوہ
بوجھے کون پہیلی سائیں
دل کی بات میں کہہ نہیں سکتا
بات کہوں میں دل کی سائیں
کیسے اپنی گردش روکوں
تو ہے مجھ میں جاری سائیں
تیری سمت نکل جاتا ہوں
چھوڑ کے نیند ادھوری سائیں
تیرے اسم کی، ہر مشکل کو
لگ جاتی ہے چابی سائیں
حمد کے نام پہ لکھی میں نے
تیرے نام اک چٹھی سائیں
یہ پھولوں کی بیل ہے کوئی
یا ہے تیری چُنری سائیں
تیرے راز کو کھول رہی ہے
پھول کی پتی پتی سائیں
دل کی دھڑکن تو لگتی ہے
تیرے ہاتھ کی گھڑی سائیں
تیرا میلہ دیکھ کے حیراں
آنکھیں سیدھی سادی سائیں
نکلی ہیں سرکار میں سیٹیں
کر دے سب کو بھرتی سائیں

سورج کیوں تندور لگے ہے
چاند لگے کیوں روٹی سائیں
تجھ کو باغوں میں چنتی ہے
ٹوکری والی بچی سائیں
میری نماز قضا کروائے
اک کالج کی لڑکی سائیں
اس کو سمجھانا ہے مشکل
اپنا من ہے موجی سائیں
تجھ سے ملوں گا بات کروں گا
کتنی ہے خوش فہمی سائیں
تیرے رستے میں قائم ہے
ہر اک گام پہ چوکی سائیں
اپنے شہر میں بھی لگتے ہیں
خود کو ہم پردیسی سائیں
جب بھی آنکھ بنانے بیٹھوں
بن جاتی ہے کشتی سائیں
کیسا زہر لیے پھرتی ہے
تیری شہد کی مکھی سائیں
باقی سب کچھ میٹھا تیرا
موت بڑی ہے کڑوی سائیں
تیرے پیاروں نے نہلایا
میں تھی میل کچیلی سائیں
تیرے نام پہ ہی چلتی ہے
سب کی دُنیا داری سائیں
کھپ سفارش سے جائے گی
ہر دانہ ہے داغی سائیں
کن گوداموں سے آئے ہیں
بکنے تیری منڈی سائیں
کب تک ڈھوئیں جسم پہ اپنے
اپنے جسم کی بوری سائیں
چین رہی ہے ہم کو ہر دم

دن اور شب کی چکی سائیں
اپنی قبر پہ کب تک ڈالوں
اپنے جسم کی مٹی سائیں
میرا نشہ پورا رکھنا
میں ہوں تیرا عادی سائیں
کیوں پٹڑی پہ چلتی نہیں ہے
یہ جیون کی گاڑی سائیں
گر جاتا ہوں پربت سے میں
کھل جاتی ہے رسی سائیں
میرے قد کے مطابق کیوں ہے
تیری ہر اک سولی سائیں
تیرے نام پہ کیوں چلتی ہے
بندوقوں کی گولی سائیں
یہ جیون کی پتنگ سلامت
تیرے ہاتھ میں چرخی سائیں
کل تو غبارہ ہاتھوں میں تھا
آج تھما دی لاٹھی سائیں
خود کو لیپ نہیں کر پاتا
آ جاتی ہے آندھی سائیں
آنکھوں میں کیوں رکھ دی تو نے
اک خوابوں کی ڈھیری سائیں
دن ہیں اتنے لمبے لمبے
راتیں اتنی چھوٹی سائیں
نیند کی قید میں کیوں ہوتی ہے
سپنوں کی شہزادی سائیں
جانے کیسی لگتی ہوں گی
تجھ کو آنکھیں گیلی سائیں
شکرانے کے نفل پڑھوں گا
کر دے نوکری پکی سائیں
تیرے اس رنگین جہاں میں
میں ہوں کالی کلوٹی سائیں
میری آنکھوں سے بہتے ہیں
گنگا، جمنا، راوی سائیں
روزِ ازل سے روزِ ابد تک
ہم ہیں تیرے کشتی سائیں

دل کرتا ہے چوری کر لوں
تیرے حساب کی کاپی سائیں
تیرے آگے بندھ جاتی ہے
شاہوں کی بھی گھگھی سائیں
آ کر تیرے کمبل میں بھی
کیوں لگتی ہے سردی سائیں
ملا سے کہہ، سونے دے ناں
نیند ابھی ہے کچی سائیں
تیری دنیا کی محفل میں
سب باتیں ہیں رٹی سائیں
اپنا کھیل دکھانے کی ہے
اب تو میری باری سائیں
جن کے گھر نہیں بستے ان کی
کس نے بنائی جوڑی سائیں
کچھ جسموں پہ تو نے چلائی
کتنی ستھری قینچی سائیں
میری مرضی کوئی نہیں ہے
اچھا تیری مرضی سائیں
خود ہی بولنا میری طرف سے
مجھ سے بات نہ ہوگی سائیں
تیرے بارے میں کیوں میرا
دل ہو جائے چوری سائیں
تیرے جھگڑے چلتے ہیں جب
گر جاتی ہے جھگی سائیں
ان کے بارے کیا سوچا ہے
زیست ہے جن کی گالی سائیں
ڈھنگ سے کام نہیں ہو سکتا
دنیا ہے بے ڈھنگی سائیں
روز کچل کر گزرے ہم کو
تیری شاہی سواری سائیں
تیرے مجاور لے جاتے ہیں
میری آدھی روزی سائیں
ان کے پاس چلے جاتے ہیں
تو سنتا ہے جن کی سائیں
دور کیے رکھتی ہے تجھ سے

دو لفظوں کی دوری سائیں
دکھ سے میری کیوں ہے اتنی
گہری رشتہ داری سائیں
دیکھی ہے تاریخ الٹ کر
تو ہے بڑا بے دردی سائیں
جتنے لوگ برے ہیں ان کی
مٹی کس نے گوندھی سائیں
کیوں ہوتی ہے کچھ لوگوں کی
قسمت اتنی کھوٹی سائیں
دنیا بنا کر دے دی مجھ کو
کیوں ماچس کی تیلی سائیں
جیسے میرے خلاف ہے کوئی
سازش سوچی سمجھی سائیں
تیری دنیا میں رہتے ہیں
ہم تو بن کر ذمی سائیں
جگ میں کیا کام ہے میرا
میں پیروں کی جوتی سائیں
تیرے نام پہ کھیل رہے ہیں
اپنے لہو سے ہولی سائیں
عمر گزاری جیل میں تیری
اور سزا ہے کاٹی سائیں
تجھ سے کیسے ہو سکتی ہے
اتنی بے ترتیبی سائیں
کون بھرے گا روزِ محشر
جو نقصان ہے جانی سائیں
تیرے نام پہ کب تک ہوگی
ہر جا بھتہ خوری سائیں
استغفار کروں میں کیسی
باتیں الٹی سیدھی سائیں
تیری ڈھیل پہ کر لیتا ہوں
میں تھوڑی سی مستی سائیں
ہم میں اتنی کمیاں رکھ دیں
ہو گئے ہیں ہم بسی سائیں
اچھی کر دے آخر میری
جو گزری سو گزری سائیں

# نعت

قلب و جا کا ہیں سہارا رحمتہ للعالمینؐ
ہر لبِ مُضطر پکارا ' رحمتہ للعالمینؐ
ہر بشر ہے گردشِ شام و سحر سے دم بخود
اِک نظر اُس پر خدارا ' رحمتہ للعالمینؐ
سَیلِ تُندوتیز میں سارے سفینے بے اماں
عافیت کا ہیں کنارا ' رحمتہ للعالمینؐ
وحشتِ دل کی تسلّی کے لئے اللہ نے
اسم اعظم ہے اُتارا ' رحمتہ للعالمینؐ
رشتہ ہائے رُشد' رفت آشنا ہوتے گئے
آپؐ نے اُن کو سنوارا ' رحمتہ للعالمینؐ
ظلمتوں کی یورش پیہم پہ سکتہ آ گیا
کیا چمک اُٹھا ستارا ' رحمتہ للعالمینؐ
حدِ امکاں سے بھی بڑھ کے جس قدر اوصاف ہیں
آپؐ کا سب پر اُجارا ' رحمتہ للعالمینؐ
یوں تو سب رشتے جہاں کے مجھ کو پیارے ہیں ریاضؔ
دو جہاں میں سب سے پیارا ' رحمتہ للعالمینؐ

سیّد ریاض حسین زیدی/ ساہیوال

لکھیں جو حمد تو لکھتے ہیں ہم وضو کر کے
کہیں جو نعت تو روضے کو روبرو کر کے
برس رہے ہیں جو موتی چمک رہی ہے کلی
حبیبؐ سے پلٹا ہے گفتگو کر کے
یہ لگ رہ ہے ہواؤں کی نرم آہٹ سے
کوئی ہے محوِ سفر اُنؐ کی آرزو کر کے

یہ رنگ و نُور جو پھیلا ہے آس پاس مرے
تمہاری ذات کے انوار کی نمو کر کے
ہرا بھرا مرے دل کا چمن ہے فیضِ نبیؐ
نگاہِ لطف و کرم پائی جستجو کر کے
جمالِ فخر سے آگے کمالِ فن بھی تو دیکھ
کہ چاک داماں اُٹھے بزم سے' وضو کر کے
درِ بہشت پہ ٹھہرے ہیں انبیائے کرام
حضورؐ پہنچیں گے اُمت کو سرخرو کر کے
مرے تو مان کبھی ربّ کار ساز رہے
وہ شانِ کبر مجھے سب سے بے نیاز رہے
جبیں پہ داغ بہت اور میں تہی دامن
ہمری میوں کا بھرم اے خدا' نماز رہے

عرفانہ امر/ گوجرانوالہ

نبیؐ کے ذکر سے روشن ستارہ مل گیا ہے
مجھے بھی رہ نمائی کا اشارہ مل گیا ہے
بھنور تک لائی مجھ کو اس طرف جانے کی خواہش
نبی کا نام لیتے ہی کنارہ مل گیا ہے
یقیناً یہ نبیؐ کی یاد ہی کا معجزہ ہے
مجھے بھی زندہ رہنے کا سہارا مل گیا ہے
نبیؐ کی نعت صبح و شام پڑھنے کا ثمر ہے
مجھے ہر درد کا ہر غم کا چارہ مل گیا ہے
قمر یہ بھی عطا نعتِ رسولِ پاکؐ کی ہے
محبت کا مجھے مہر استعارا مل گیا

قمر ریاض/ مسقط

دل مردہ کو زندگی دے دے
یا نبیؐ مجھ کو روشنی دے دے
تیری عظمت کو میں سمجھ پاؤں
ایسی تابندہ آگہی دے دے
عشق تیرے میں رہوں صدا بسمل
جاوداں مجھ کو بے خودی دے دے
میری آنکھوں میں چاندنی دے دے
اپنا دیدار یا نبیؐ دے دے
میری سوچوں میں عکس تیرا رہے
مجھ کو جذبۂ سرمدی دے دے
اپنے شاہد کو خالی ہاتھ نہ چھوڑ
ذکر کی اس کو چاشنی دے دے

عبدالرشید شاہد/ ننکانہ صاحب

### قطعہ

روزہ رکھ کر بھول گیا تھا
بھوک کی شاخ پر جھول گیا تھا
بعد میں افطاری کی ایسی
پیٹ غبارہ پھول گیا تھا

ناز اوکاڑوی

# کالے انگریز!

عطاء الحق قاسمی/لاہور

میں نے اپنے ایک گزشتہ کالم میں پاکستان کی ''اداس'' نسلوں کا ذکر کیا تھا مگر یہ بتانا بھول گیا تھا کہ یہ نسلیں صرف پاکستان میں ''کاشت'' نہیں کی گئیں۔ بلکہ دنیا کے سبھی مغلوب ملکوں میں اس کی ''شاخیں'' موجود ہیں چنانچہ غالب ملکوں کو اپنی پالیسیوں کے نفاذ کے لئے کچھ زیادہ زحمت نہیں اٹھانا پڑتی، ان کی ہر ادا پہ فریفتہ یہ نسلیں اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر حکومت کرتی ہیں اور دنیا کے تمام مغلوب ملکوں میں اسی نسل کے افراد پالیسی ساز ہوتے ہیں جہاں نہ ہوں وہاں حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے اور اسی ''خود کاشتہ'' پودے کو تخت پر بٹھا کر اپنی مرضی کی پالیسیاں نافذ کر دی جاتی ہیں۔ اس نسل کے افراد کے ''ریفریشر کورس'' کے لئے غالب ملکوں نے اپنے ہاں متعدد سکالرشپس رکھے ہوئے ہیں چنانچہ وہ چار ماہ کے ''تربیتی کورس'' مکمل کر کے جب بمغلوب لوگ وطن واپس آتے ہیں تو ''مذہبی جوش و خروش'' کے ساتھ دوبارہ اپنے ''فرائض منصبی'' انجام دینے لگتے ہیں!

ہمارے ہمسایہ ملک بھارت میں بھی یہ کلاس جنم لے چکی ہے جس طرح ہمارے ہاں کراچی، لاہور، پشاور اور اسلام آباد میں اس کلاس کے افراد زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بھارت کے جن شہروں میں انکی بہتات ہے ان میں بمبئی، کلکتہ اور دہلی وغیرہ شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام آباد میں ڈاکٹر قدیر خاں کی قبر بنانے والے اس نسل کے افراد جب خیر سگالی کے دورے پر یا شاباش وصول کرنے کے لئے انڈیا جاتے ہیں تو واہگہ سے لے کر کلکتے تک ان کا پرتپاک استقبال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ جتنے دن بھارت کے ان شہروں میں گزارتے ہیں، یہ ان کی زندگی کے بہترین دن ہوتے ہیں کہ وہاں انہیں لمبے بال، ٹنڈیں، گیلس والی پتلونیں، پائپ، جام اور ملگجی داڑھیاں زیادہ Relaxed ماحول میں نظر آتی ہیں اگرچہ یہ دن ان کی زندگی کے بہترین دن ہوتے ہیں مگر یہ دن برسوں پر محیط نہیں ہوتے، انہیں واپس اس ''ناکام ریاست'' میں آنا ہی پڑتا ہے۔ جہاں ان کی بادشاہیاں قائم ہیں۔ ان کی بہترین مثال فہمیدہ ریاض (اردو میڈیم برانچ) ہیں۔ جنہیں پاکستان سے فرار کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں Poetess in campus کے منصب پر فائز کیا گیا تھا مگر انہیں جونیجو دور میں معافی نامہ لکھ کر واپس پاکستان آنا پڑا تھا۔ یہ کیسی ناکام ریاست ہے جس کی حدود کے باہر قدم رکھتے ہی ان لوگوں کی ناکامیوں کا آغاز ہو جاتا ہے؟

میں نے اس طبقے کے شاعروں، ادیبوں اور گلوکاروں کو بھی جن کی تعداد اگرچہ دو ہاتھوں کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، قدرے قریب سے دیکھا ہے ان کے گیتوں، ڈراموں اور کہانیوں میں وہ مسائل نظر آتے ہیں جو مغربی ملکوں میں صنعتی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں مگر وہ انہیں پاکستانی عوام کے مسائل سمجھ کر بیان کرتے ہیں جبکہ ہمارا ملک ابھی صنعتی دور میں داخل ہی نہیں ہوا۔ یہ لوگ اگر اپنی اردو کہانیاں، ڈرامے اور گیت انگریزی میں ترجمے کے لئے دیں تو اس معذرت کے ساتھ واپس ہو جائیں کہ یہ تو پہلے ہی انگریزی میں ترجمے کے لئے دیں تو اس معذرت کے ساتھ واپس ہو جائیں کہ یہ تو پہلے ہی انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں۔

میں نے اپنے گزشتہ کالم میں وعدہ کیا تھا کہ اس نسل کے مردوں کے علاوہ خواتین بلکہ لیڈیز بلکہ Babes یا Chicks کا ذکر بھی کروں گا۔ مگر یہ بہت مشکل کام ہے کہ اس میں کچھ نازک مقام بھی آتے ہیں اس طبقے کی خواتین مردوں سے زیادہ اندرونی کرب کا شکار رہتی ہیں۔ جب مشرقی گھر میں مغرب کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے تو پھر اس کے نتائج بھی وہی برآمد ہوتے ہیں جن نتائج سے آج مغرب دوچار ہے۔ یہ طبقہ ایک سے زیادہ شادیوں کا مخالف ہے اور ''مولوی'' اس کے حق میں ہے یہ مخالف ایک سے زیادہ شادیاں ''افورڈ'' کرتا ہے۔ چنانچہ مخالف کے ساتھ ساتھ شادیاں بھی کرتا چلا جاتا ہے، بیچارا ''مولوی'' افورڈ نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کے حصے میں صرف حمایت آتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس طبقے میں طلاقوں اور تعدد ازدواج کی شرح عام پاکستانیوں سے کہیں زیادہ ہے، جس کی زد میں ان کے وہ بچے آتے ہیں جنہیں خاندانی توڑ پھوڑ

کے نتیجے میں وہی مسائل جنم لیتے ہیں جن کی زد میں آیا ہوا مغرب اپنی تمام تر ترقی کے باوجود کراہتا نظر آتا ہے!

اس طبقے کی خواتین اندرونی زیبائش (Interior Decoration) اور بوتیک کے کاروبار میں زیادہ ہیں۔ پریذیڈنٹ ہاؤس اور پرائم منسٹر ہاؤس سے لے کر کمشنر اور ڈپٹی کمشنر ہاؤس تک کی اندرونی آرائش و بیرونی زیبائش کے ٹھیکے اور پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ریاستی مہمانوں کے اعزاز میں منعقد ہونے والے ثقافتی شو بھی اسی طبقے کی وساطت سے اسی طبقے میں تقسیم ہوتے ہیں اور کروڑوں روپوں کا یہ کھیل پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور فوجی حکومتوں میں یکساں طور پر جاری رہتا ہے کہ تبدیلی تو صرف اوپر اوپر آتی ہے اصل حکومت جن کے پاس ہے وہ انہی کے پاس رہتی ہے!

میں گذشتہ ہفتے اپنی اہلیہ کے ساتھ اس کی ایک ''اداس'' دوست کے والد کی رسم قل میں شرکت کے لیے گیا۔ یہ قل مخلوط نہیں تھے کہ ان کے رشتے داروں میں اللہ وسایا قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جب ہم واپس گھر کو جانے لگے تو میں نے اپنی اہلیہ سے پوچھا ''اندر کیا صورت حال تھی؟'' اہلیہ نے کہا ''گھر والوں کو جس پر شک گزرتا کہ یہ قرآن پڑھ سکتا ہے۔ وہ اس کے ہاتھ میں سیپارہ پکڑا دیتے۔ عجیب قسم کا قل تھا، مرحوم کی صرف ایک بیٹی رو رہی تھی!''

میں نے کہا ''باہر بھی یہی صورتحال تھی، تعزیت بھی بہت ''ریزرو'' انداز میں کی جا رہی تھی، انگریز ایسے مواقع پر مہمانوں کو بیئر پیش کرتے ہیں، ان کالے انگریزوں نے اتنی گرمی میں ٹھنڈے پانی کا بھی نہیں پوچھا، یہ قل نہیں ''ڈسکو قل'' تھے!''


جدید غزل کے منفرد اور ممتاز شاعر

اسلم کولسری

کا تازہ شعری مجموعہ

''کیف''

اشاعت کے آخری مراحل میں

اہتمام: القمر انٹر پرائز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور



**اُردو کا ارتقاء**

☆ ڈاکٹر وحید قریشی
- اُردو ادب کے ہر قابل ذکر عہد کا جائزہ
- قیمت 150 روپے

**مصحف تغزل**

☆ ڈاکٹر سید تقی عابدی
- علامہ نجم آفندی کی غزلوں کا مجموعہ
- قیمت 350 روپے

**اصلاح تلفظ و املا**

☆ طالب ہاشمی
- اصلاح تلفظ و املا مثالوں کے ساتھ
- قیمت 250 روپے

**اُردو غزل**

☆ یوسف عیسیٰ خان
- اُردو غزل کی جامع تاریخ مع انتخاب کلام
- قیمت 600 روپے

☆☆☆

**قلم درازیاں**

☆ پروفیسر افضل علوی
- چلبلے اور چہچہاتے فکاہی کالموں کا مجموعہ
- قیمت......روپے

**سائنس، صحت اور روحانیت**

☆ مہر علی قریشی
- مخفی قوتوں کی تشریح حبس دم مراقبہ عجائبات سائنس
- قیمت 200 روپے

**شعر و قافیہ**

☆ علامہ صوفی وارثی میرٹھی / افسانہ مظفر وارثی
- فنی عروض پر ایک مستند کتاب
- قیمت 250 روپے

**رقص ابلیس**

☆ ایم اسلم
- انقلاب 1947ء کی ایک خونچکاں داستان

بقول محمد حسن عسکری

''اس موضوع پر اُردو میں اپنی قسم کا پہلا ناول ہے''

- قیمت 300 روپے

القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

# احمد سجاد بابر کی حمد نگاری

خورشید بیگ میلسوی/ایلسی

کچھ لوگ اپنی ذات میں انجمن ہوا کرتے ہیں

'احمد سجاد بابر' بھی ایسے ہی ہمہ جہت قلمکار ہیں جو بیک وقت ایک اعلیٰ شاعر، صاحب اسلوب نثر نگار، متاثر کن افسانہ نگار، عمدہ نقاد اور نامور ماہر لسانیات ہیں۔ حال ہی میں ان کا حمدیہ شاہکار ''ردائے شب پر ستارہ جھلمل'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے جو ادبی دُنیا کو چونکانے کا باعث بنا ہے۔ اپنی ادبی کاوش کو انہوں نے منظوم صورت اپنے والد سے منسوب کیا ہے، کتاب کا پیش لفظ بھی ''خود احتسابی'' کے نام سے نظمیہ بیانئے میں شامل ہے۔ یعنی احمد سجاد بابر کو محبوب اللہ نظر آیا جو کہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، چنانچہ اقتضائے فن اور تمنائے دل یہی ٹھہری کہ اُس عظیم خالق و مالک کا ذکر کیا جائے جو بظاہر پس پردہ ہے مگر اس کا جلوہ کائنات کی ہر شے میں دکھائی دے رہا ہے۔ احمد سجاد بابر اسی خواہش کو نہاں خانہء دل میں سجا کر علم و ادب کی سمت متعین کر کے اس خوبصورت اور عظیم سفر کو شروع کر چکے ہیں جس میں روایت کی بجائے جدت اور نقل فن کی بجائے تجربے کی اہمیت اہمیت کا دخل ہے۔ یہ ایک مشکل اور سخت چٹان سے تخلیقی وجود کے سر ٹکرانے کا معاملہ تھا۔ مگر انہوں نے ''حمد'' کی شیریں کے لئے فرہاد بن کر کوہ کنی کا بیڑہ اُٹھایا اور دودھ کی نہر نکال کر دکھائی اور یہ ''شیریں'' حمد کے مضامین و بیان کے انداز میں بطور ندرت ان کے حصے میں آ گئی اور وہ کہہ اُٹھے

خالق کُل جہاں معتبر کیجئے
میں کہانی میں ہوں رائیگاں کی طرح

............

زندہ رہنے کو حمد کہتے ہیں
ایک گھنے کو حمد کہتے ہیں
قادرِ کُل جمال دیتا ہے
ہم تو کہنے کو حمد کہتے ہیں

دراصل احمد سجاد بابر آغاز سفر میں ہی اپنے اسلوب کے قطبی ستارے بن چکے ہیں۔ جس کی وجہ جینئس کا وہ خانہ ہے جس میں بہت سارا علم ہے۔ بس اسے خدا پرستی کی شعری تفہیم کی جانب وقار اور لطافت کے ساتھ لانا تھا.........اور وہ لے آئے!!

خدا کی تعریف ثواب کا کام ہے مگر ''حمد'' لکھنا تخلیقی عمل ہے جس میں بڑا مقابلہ ہے کیونکہ وحدت پرستی کئی مذاہب کا حصہ ہے، جنہوں نے مالکِ دو جہاں کی حمد لکھی، ہمیں احمد سجاد بابر اس حقیقت کا رمز شناس نظر آتا ہے، ورنہ وہ یہ شعر نہ کہتا

اب پہن لو الست کا چولا
اس کے پہنے کو حمد کہتے ہیں

احمد سجاد بابر کی حمدیہ شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے ہر مصرعے میں کثرت مطالعہ جھلک رہی ہے، انہوں نے محض قافیہ پیمائی نہیں کی بلکہ اللہ کو سمجھنے اور کھوجنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لئے خالص تحقیق کی ہے جس کا ثبوت ''لا تقنطو' حبل الورید' کسوۃ الکعبہ' علام الغیوب' لا احصی ثنا مولا' لیس کمثلہٖ' نحن الزارعون'' جیسی تراکیب ہیں' اس کے علاوہ قرآن مجید سے ''ساجدین' شاکرین' غابرین' خاسرین' صاغرین' صادقین'' جیسے قوافی کا چناؤ بھی ان کے تدبر اور فکر کی علامت ہے۔ ''میثاق الست'' کا مکمل واقعہ نظم کرنا' سورہ نور اور سورہ الاخلاص کی روشنی میں خدائے بزرگ و برتر کی ہستی کا نقشہ کھینچنا ان کی فنی مہارت اور بھرے دامن کی نشاندہی ہے۔ عہد حاضر میں اسلام میں نظریہ وحدت کا تصور دیگر مذاہب کے مقابلے میں مختلف ہونے کی تعلیم کی ضرورت ہے یعنی عیسائیت میں ''نظریہ تثلیث'' اسی طرح دیگر مذاہب میں خدا کی تجسیم کرنے کی یہی کوشش صلیب' بت' مظاہر فطرت کی پرستش وغیرہ میں نظر آتی ہے' اسی لئے ان کی نظم ''وحدہٗ لاشریک'' خدا کے لاشریک' غیب اور عرش بریں کے علاوہ ہر کہیں ہونے کے غیر تجسیمی پیکر کی روشنی کا حوالہ دیتی نظر آتی ہے۔

اے دیارِ روشنی کے مکیں
لیس کمثلہٖ کے نگیں
تجھ سا کوئی ممکن نہیں
اے خالقِ آسمان و زمیں

احمد سجاد بابر نے اپنی شاعری میں قوافی' ردیف اور ہیئت نظم میں تجربات کر کے شاعری کو نئی لطافتوں سے جس کامیابی سے ہمکنار کیا ہے' وہ نئے عہد کی ''حمد'' کے خدوخال اُجاگر کر رہی ہے کہ عظیم اور واحد متقابلہ صفات کی مالک ہستی کی حمد کہیں تو وہ نظر بھی آ جائے

سب دُکھوں کا حساب رکھتا ہے
سارے رستے گلاب رکھتا ہے

وہ خالق کائنات کی متقابلہ و متضاد صفات کو حمد

میں یوں بیان کرتے ہیں

اُسے میں نے ستارے کی طرح دیکھا
کبھی اُس کو شرارے کی طرح دیکھا

گویا وہ عظیم خدا القہار بھی ہے اور الرحمٰن بھی
......... ''معراج'' کے مضمون کے بیان کرنے والے حمدیہ شعر دیکھئے

وہ نُورِ کُل جو آنکھوں سے پیمبرؐ نے
بُلانے پر سپارے کی طرح دیکھا

ایک اور بات جو احمد سجاد بابر کی شاعری میں انفرادیت کی حامل ہے' وہ یہ کہ حمدیہ اشعار میں حرف ''تُو'' حمد کی ایک مستقل ردیف ہے' کہیں کہیں اُنہوں نے ذاتِ ربانی کو جمع متکلم یعنی ''تُم'' سے مخاطب کیا ہے

تُمھی آ کے بچاتے ہو نشانے سے
اُٹھی تلوار پہ غالب تُمھی تم ہو

اپنی دھرتی اور وسیب سے تعلق کا اظہار عشقِ الٰہی میں کرتے ہوئے ردیف ''سائیں'' کو نبھاتے ہوئے روایت کا حسین انداز اپناتے ہیں

اب بھی سقراط ہے پسِ زنداں
زہر پیالے میں ڈال دے سائیں
آن پہنچے ہیں ہاتھیوں والے
چند کنکر اُچھال دے سائیں
تُو مجھے چاک پر گھما پھر سے
اپنی مرضی میں ڈھال دے سائیں

عشق کی انتہا پر ''مَن وتُو'' کے لمحے آتے ہیں مگر احمد سجاد بابر ایک موحد کے مقامِ معین پر موجود رہتا ہے تاکہ عشق جوازِ عبودیت کو نہ لے جائے اور محبت بھی اپنی تفہیم کا اندازہ نبھائے۔ یہ نیک ساعت ''عشق'' میں نمائش کے روایتی مقام سے ہٹ کر موحد کے مقام پر رہنے کی ہنر مندی ہے۔ حمد میں اس کی جا بجا ضرورت پڑتی ہے' یہ سوال بن کر جذبے میں انگڑائی لیتی ہے۔ جس کا شعری رنگ و آہنگ میں ظہور' کامل جواب ہو تو احمد سجاد بابر کی حمدیہ شاعری کے سفر سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ اشعار دیکھئے

کیا کبھی بھی خدا نہیں دیکھا؟
دیکھنا صحن میں شجر لوگو

.........

میرے پیچھے مری ماں کی دُعائیں ہیں
مجھے ہر پل خدا محفوظ رکھتا ہے

.........

مجھ کو خدا اگر بام پہ رکھ دے
کیسے ہرائے' مات ہے قاصر

''حمد'' کی روایت میں میر و سودا کے بعد خواجہ میر درد' امیر مینائی' الطاف حسین حالی' حفیظ جالندھری' علامہ اقبال' محسن کاکوری اور اس عہد کے بعد عہدِ حاضر کے کئی معتبر اسمائے گرامی ہیں' ورنہ اکثر شعرائے کرام نے غزل کے حُسن سے متاثر ہو کر اور نظم کے ردھم کی جولانی میں اپنی فکری' نظری کاوش کو سپردِ قلم کیا ہے۔ اللہ جیسی عظیم ہستی' مالکِ کون ومکان' مالکِ کُن فکاں کی تعریف کسی کسی کے حصے میں آئی ہے۔ احمد سجاد بابر بھی اسی عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ انہیں بھی غزل ونظم کے مجازی حسن نے اپنی جانب ضرور کھینچا ہوگا مگر انہوں نے حسنِ حقیقی کے عشق میں رطب اللسانی کو مشقِ سخن بنا کر اپنے شعور کے کامل ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ محبت خدائے بزرگ و برتر کے لئے ان کا اضطراب' لگن اور شعری تخلیق کا فن بلاشبہ حیرتوں کا عالم لئے ہوئے ہے۔ پھر ان کی حمد نگاری خالی خولی روایتی حمد نہیں ہے بلکہ ردیف قافیے سے لے کر مضامین تک جدت طرازی کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے نظم میں عصرِ حاضر کے مسائل کی آگہی اور بصیرت کے ساتھ طلبِ نصرتِ خداوندی کے لئے جو استغاثہ بلند کیا ہے وہ بھی ان کی حمدیہ روایت میں جوازِ جدت کی طرح موجود ہے۔ ردیف کے حوالے سے ان کی حمد کے اس آہنگ و رنگ کی کچھ مثالیں دیکھئے

مرا ہم سفر گُلِ سُرمگیں' ہے یہیں کہیں
وہ دعائے شب' وہ فلک نشیں' ہے یہیں کہیں

.........

کچے آنگن بیٹی بیٹھی روتی ہے
چٹھی اُس کو بھیجو دھانی یا اللہ

.........

بابر چلو کہ مانگتے ہیں احترام سے
اک گوشہ عرشِ بریں' جبل الورید سے

.........

روشنی کا جہاں کسوۃ الکعبہ ہے
تیرگی میں عیاں کسوۃ الکعبہ ہے

المختصر' احمد سجاد بابر کی حمدیہ کتاب ''ردائے شب پر ستارہ جھلمل'' غزل کے پیکر میں کہی گئی وہ خوبصورت اور دل آویز شاعری کا ارمغان ہے جو حمد کے پاکیزہ اکناف و اطراف میں عبودیت کے اعتراف سے مزین داخلی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ حیاتی ومشاہداتی منظر ناموں سے پُر ہے۔ ان کے اس حمدیہ مجموعہ میں اخلاص' محبت اور بصیرت و بصارت کے علاوہ فنی پختگی بھی دکھائی دیتی ہے جو انہیں کشاں کشاں ارتقائے فن کی طرف لے جا رہی ہے۔

# سردار جعفری کی "نظم ونثر" تاریخی مکالمہ

رئیس الدین رئیس / انڈیا

علی سردار جعفری نظم ونثر دونوں مملکتوں کے تاجدار تھے وہ ترقی پسند تحریک کے رُوحِ رواں تھے جو علی گڑھ تحریک کے بعد سب سے منظم و مضبوط تحریک تھی' سردار جعفری بے مثال شاعر بھی تھے اور منفرد اسلوب کے نثر نگار بھی انہوں نے تنقید بھی لکھی اور غیر تنقیدی تحریریں بھی' افسانے بھی لکھے اور ڈرامے بھی ان کے یہاں نظم جس توانائی سے اُبھرتی ہے وہ دوسرے ترقی پسند شاعروں کے یہاں نہیں ہے انہیں اُردو' فارسی' انگریزی سمیت کئی زبانوں پر عبور تھا اور جوش ملیح آبادی کے بعد قادر الکلامی ان کے یہاں سب سے زیادہ ہے لیکن تہہ داری ان کی خاص صفت ہے جو جوش کے یہاں بہت کم ہے سردار جعفری کی شعری ونثری تصانیف کی خاصی تعداد ہے وہ 29 نومبر 1913ء اس جہان آب وگل میں وارد ہوئے تھے اور یکم اگست 2000ء کو یہاں سے رحلت کی ان کی سب سے پہلی کتاب افسانوں کا مجموعہ منزل ہے جو 1938ء میں شائع ہوا تھا بیسویں صدی کے نصف اول میں ترقی پسند تحریک آئی اور اس کے بعد 1936ء میں ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی لیکن ترقی پسندوں میں ایسا دوسرا کوئی شخص نظر نہیں آتا کہ نظم ونثر پر بہ یک وقت اتنی کامل اور ماہرانہ دسترس رکھتا ہو' ان کی اہم ترین نثری تصانیف میں اقبال شناسی پیغمبران سخن ترقی پسند ادب اور لکھنؤ کی پانچ راتیں ہیں شاعری میں پیراہن شرر ایک خواب اور نئی دُنیا کو سلام ایشیا جاگ اُٹھا خون کی لکیر امن کا ستارہ پتھر کی لکیر بہت اہم کتابیں ہیں سردار جعفری کی تصانیف ہیں نہ صرف جن میں حال کا منظر دکھائی دیتا ہے بلکہ ماضی کے گم گشتہ لمحوں کے چہرے بھی نظر آتے ہیں ان کے یہاں وقت کا کردار بے حد اہم ہے وقت حکمراں ہے وقت کی گرفت میں ماضی وحال سبھی ہیں وقت اگر رحمدل شفیق اور نرم مزاج ہے تو وقت بے حد سفاک اور شقی القلب بھی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس تحریر میں ان کی شاعرانہ عظمت ان کے افکار کی ثروت مندی پر بھی بات ہو ان کے نثری فن پاروں پر بھی گفتگو کی جائے لیکن بات سب سے پہلے ترقی پسند تحریک اور اس سے متعلق ادب پر جس نے بیسویں صدی کے نصف اول میں ظہور پذیر ہو کر ساری دُنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ جب دُنیا سے نوآبادیاتی نظام ختم ہو رہا تھا سوویت یونین وجود میں آچکا تھا مارکس ولینن کے نظریات فروغ پذیر تھے عالمی سطح پر اس تحریک نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کا ذکر تو بہت طویل ہے ہم اپنی اس تحریر میں اُردو ادب کے حوالے سے بات کریں گے کہ یہ کس طرح اثر انداز ہوئی اُردو ادب کو ثروت مند بنانے میں اس کا کیا کردار رہا' اس نے ادیبوں شاعروں کی ایک بڑی نسل پیدا کی جواب بھی سرگرم عمل ہے اس تحریک کا اصل مقصد اشتراکی کی انقلاب تھا جیسا کہ ترقی مصنفین کے اعلان نامے میں کہا گیا تھا:

"ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دُکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔"

گویا ایک طرح سے یہ اشتراکیت کی تبلیغ تھی اس کے فروغ کا سلسلہ تھا اس وقت جبکہ ہندوستان جنگ آزادی کی گرفت میں تھا اس تحریک کا نمودار ہونا زخموں پر مرہم کے مترادف تھا سب نے اس کا خیر مقدم کیا شاعروں ادیبوں کا ایک انبوہ کثیر اس کے پرچم تلے جمع ہوتا چلا گیا' اس تحریک کے خدوخال نمایاں ہوئے اور یہ غیر منقسم ہندوستان کے ادبی وسماجی معاشرے پر اثر انداز ہوتی چلی گئی لوگ تبدیلی کے خواہاں تھے اس لئے اس کے پرچم تلے آنے میں انہیں کوئی تکلف نہیں تھا حالانکہ 1939ء میں لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا وہ نظریاتی طور پر ترقی پسند تحریک کے خلاف تھی لیکن زیادہ موثر ثابت نہیں ہوسکی تحریک کا ادبی نظریہ کیا تھا سردار جعفری نے اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں لکھا ہے:

"شاعر یا ادیب کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے محرکات گردوپیش کی اس دُنیا میں پائے جاتے ہیں جہاں تمام انسان زندگی بسر کرتے ہیں یہ محرکات خود اس سماجی واقتصادی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کی شیرازہ بندی

کرتا ہے اس لئے اعلیٰ شاعری یا ادب ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ترجمان ہوتا ہے۔''

سردار جعفری کی شعری ونثری تخلیقات کو اسی نظریے کی روشنی میں دیکھا جانا چاہئے وہ ماضی کی بات کر رہے ہوں یا حال کی وقت ہر طرف حکمراں دکھائی دیتا ہے وہ ظلم وتشدد کی مذمت کرتے ہیں نئی صبح کی بشارت بھی دیتے ہیں ان کا لہجہ یہ ہوتا ہے۔

سنا ہے آئے گا پیغمبر مسیحا دست
قدیم عہد کی صورت نئے زمانے میں
نکالے جائیں گے پھر زندگی کے معبد سے
بشر کے اشکوں کے تاجر لہو کے بیوپاری
خدا کے نام کو نیلام کر نہ پائیں گے
وہ چاہے صاحب تسبیح ہوں کہ زناری

ان مصرعوں میں انقلاب بھی ہے مستقبل کی آہٹیں بھی اور آمادۂ طلوع روشنی بھی' اپنی ایک تحریر لمحوں کے چراغ میں انہوں نے وقت کی اس طرح وضاحت کی ہے:

''وقت انسان کے تصور میں ایک کردار ہے جیسے پھول ہنستا ہے شبنم روتی ہے گرمیاں آتی ہیں جاڑے چلے جاتے ہیں اسی طرح وقت اڑتا ہے گزرتا ہے تخلیق کرتا ہے تخریب کرتا ہے یہ وقت کا سائنٹفک تصور نہیں شاعرانہ تصور ہے جدو جہد حیات میں انسان کا علم اور عمل دونوں بڑے حربے ہیں اور انہوں نے فطرت کے مظاہر کو انسانی صفات سے آراستہ کر دیا ہے یہ ایک طرح سے تخریبی طاقتوں پر قابو پانے کی کوشش ہے وقت کے گزرنے کا احساس بہت شدید ہے جس کا اظہار ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں کرتا ہے اس کی لہروں میں دُنیا کے ساتھ انسان اپنی عمر کو مٹتا ہوا دیکھتا ہے اس لئے موت پر قابو پانے کی کوشش میں وہ وقت کو فتح کرنا چاہتا ہے اپنا دست تخلیق بلند کرتا ہے جس سے وقت کے دست تخریب کو روکا جا سکے آرٹ اسی دست تخلیق کا معجزہ ہے جس کے پیچھے انسان کی قوت مشاہدہ خودشناسی اور لامحدود تخیل کی طاقتیں ہیں شاید اسی لئے جرمن شاعر گوئٹے نے اس خیال کے مقابلے میں کہ دُنیا فانی ہے آرٹ کو پیش کیا تھا کہ یہ تخریبی طاقتوں کے مقابلے میں فرد کو قائم ودائم رکھنے کی کوشش ہے۔

سردار جعفری کے یہاں دُنیا کی فنا انجامی کا احساس شدید ہے' کائنات کے اختتام اور وقت کے تسلسل میں ان کی ایک خوبصورت نظم کے کچھ مصرعے پیش ہیں۔

یہ نیند کی طرح نرم سبزہ
خوابوں کی طرح رمیدہ شبنم
پھولوں کی طرح شگفتہ چہرے
خوشبو کی طرح لطیف باتیں
کرنوں کی طرح جواں تبسم
شعلوں کی طرح دہکتی خواہش
تاروں کی طرح چمکتی آغوش
ساغر کی طرح چھلکتے سینے
سب قافلۂ عدم کے راہی
وادئ عدم میں چل رہے ہیں

ان تمام کیفیتوں کے بعد بھی شاعر نا اُمید نہیں ہے اسے زندگی سے کسب نشاط کا ہنر آتا ہے سردار جعفری تاریخ اور وقت کے ہر لمحے کو سمیٹنا چاہتے ہیں وہ دُنیا کی تمام گم گشتہ وموجود تہذیبوں کے رازداں ہیں۔ قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے اس سلسلے میں تفصیل سے لکھا ہے ایک اقتباس دیکھئے:

''سردار جعفری نے تہذیبی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے اپنے اشتراکی نصب العین کے پیش نظر عوامی تہذیبی نظام اور جاگیردارانہ شوکت وحشمت کے کروفر میں اولی الذکر کو ہی قابل احترام قرار دیا ہے شاعر اقدار کی جستجو میں جن راہوں پر جادہ پیما ہے وہاں بعض انسانیت سوز قابل نفریں مناظر وواقعات ایسے بھی ہیں جنھیں تاریخ کے روزن دیوار سے آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔''

شاعرانہ نظر تہذیبی ثنویت کے حامل چند کرداروں کی کس قدر خوبصورت مرقع کشی کرتی ہے۔

یہ آدمی کی گزرگاہ شاہراہ حیات
ہزاروں صدیوں کا بارگراں اُٹھائے ہوئے
اِدھر سے گزرے ہیں چنگیز و نادر و تیمور
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے
غلاموں اور کنیزوں کے کارواں آئے
خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے نہائے ہوئے
شکستہ دوش پہ دیوار چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اُٹھائے ہوئے
جلال شیخ و شکوہ برہمنی کے جلوس
ہوس کے سینوں میں آتشکدے چھپائے ہوئے
سفید قوموں کے عیار تاجروں کے گروہ
فریب ومکر سے اپنی دکاں سجائے ہوئے
غموں سے چور مسافر تھکے ہوئے راہی
چراغ روح کے دل کے کنول جلائے ہوئے
اُٹھو اور اُٹھ کے انہیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گرد سفر بنائے ہوئے

قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدین وطن
مجاہدین وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

شاعر جو اپنے اشتراکی و انقلابی مطمع نظر اور شیوۂ گفتار کے لئے مشہور ہے اور اپنی انقلابی سرشت کے سبب ابتلاو آزمائش کے صبر آزما مراحل سے بھی گزر چکا ہے ہندوستان کی تہذیبی زندگی اور اجتماعی ورثے کے حیات پرور سفر سے ایسی والہانہ رغبت اور شگفتگی رکھتا ہے جو دوسری جگہ دیکھنے کو کم ہی ملتی ہے'

سردار جعفری بے شک ہمارے ان فنکاروں میں ہیں جو نہ صرف انسانی شرف و نجات سے وابستہ اقدار و اعمال کی نیستی کے ماتم گسار ہیں بلکہ تہذیبی زندگی اور اس کی باقیات کے تسلسل کے بھی خواہاں ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آدرشوں کی باز آفرینی اور فروغ کے عہد میں انسانی وجود کی صحت بالیدگی اور روحانی ترفع کے لئے بے حد ضروری ہے

تنقید کے حوالے سے اگر دیکھیں تو سردار جعفری کی تین کتابیں ترقی پسند ادب' اقبال شناسی اور پیغمبران سخن ہیں جن میں کبیر' میر و غالب پر مضامین ہیں' بہت اہم ہیں اس کے علاوہ رسائل و جرائد میں مقالوں کی بڑی تعداد ہے' شارب ردولوی نے سردار جعفری و نقد شعر میں لکھا ہے کہ:

''ان کے تنقیدی مضامین ان کی شاعری سے کم اہم نہیں ہیں اس لئے کہ وہ ادبی مطالعہ اور تفہیم کی ایک نئی سمت و رفتار کا تعین کرتے ہیں جس کی بنیاد تہذیب عصر اور شعر کی تخلیقی جمالیات پر ہے ایسا نہیں ہے کہ اس وقت تک میر' غالب یا کبیر کے بارے میں کچھ لکھا نہیں گیا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ سردار جعفری نے نقد شعر کے لئے جس طریقے کو اپنایا وہ پیشہ ور نقادوں سے مختلف تھا اور مرے خیال میں ہمارے ادب میں اس طرح ثقافتی و تہذیبی مطالعہ عام نہیں تھا' کبیر کے متعلق کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حالت و واقعات کا کبیر سن اور تاریخ کا کبیر زندہ نہیں ہے لیکن فکر و شعور کا کبیر جذبے اور احساس شعر اور نغمے کا کبیر زندہ ہے ہر دوہا اس کی ہستی ہے ہر پد (نظم) اس کی ذات اور ہر خیال اس کی زبان اور جب ہم اس کے بولے ہوئے لفظوں کو دہراتے ہیں تو کبیر کا ساز بجنے لگتا ہے شاہی فرمان اور ڈنکے کی آوازیں گونگی ہو جاتی ہیں اور کبیر کے دل سے نکلنے والی صورت سرمدی سے روح سرشار ہو جاتی ہے پنڈت کا منتر اور ملا کی اذان آسمانوں کے سناٹے میں گم ہو جاتی ہے اور کبیر کا حرف محبت دھرتی کے سینے میں دھڑکنے لگتا ہے۔''

سردار جعفری ترقی پسند نظریے کے ادیب تھے چنانچہ انہوں نے جس موضوع پر بھی اظہار خیال کیا اس میں ترقی پسند نظریہ شامل رہا وہ اپنے ادبی عقیدے اور نظریے پر چٹان کی طرح کھڑے رہے اور انہوں نے حقیقتوں کا اعتراف بھی کیا کبیر' میر' غالب اور اقبال ان کے خاص موضوعات رہے اس کے علاوہ انہوں نے اپنی کتابوں کے جو دیباچے لکھے ہیں وہ بے حد اہم ہیں علاوہ ازیں دوسروں کی کتابوں پر تبصرے کئے ہیں ان کے ترقی پسند نظریے کے پوری طرح غماز ہیں' یہ سطور دیکھئے:

''میرا ذہن اس فلسفیانہ تربیت سے محروم ہے جس کی مدد سے زمان و مکان کے مابعد الطبیعاتی مسائل کی موشگافیاں کر سکوں' افتاد طبع کے اعتبار سے بھی میں مابعد الطبیعاتی فضاؤں میں پرواز نہیں کر سکتا لیکن میں نے وقت کو شاعرانہ طریقے سے محسوس کیا ہے کبھی ایک طاقت کی طرح کبھی ایک حسن کی طرح اور میں انسان کو بھی وقت کے دریا کی ایک موج محسوس کرتا ہوں میرا خیال ہے اقبال نے بھی وقت کو ایک شاعر کی طرح محسوس کیا ہے کائنات کے تخلیقی عمل میں اقبال نے جو لذت و مسرت محسوس کی ہے اس کا جشن اپنی شاعری میں منایا اور تصور وقت اس جشن کا ایک حصہ ہے میں نے اس تصور وقت سے جو لطف اٹھایا ہے اس میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں اسرار خودی میں اقبال کا مکمل تصور وقت موجود ہے۔''

(اقبال شناسی)

سردار جعفری کے یہاں وقت کی بہت اہمیت ہے وہ اسے جہاں کہیں پاتے ہیں اس کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں انہیں اقبال کے یہاں وقت ایک جابر قاہر اور خلاق طاقت کی طرح نظر آتا ہے جس میں بے پناہ تسلسل ہے بہتا ہوا طاقت ور دریا' جو تیرنے اور ڈوبنے والوں سے بے نیاز بہتا چلا جا رہا ہے میر کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

''میر کے بعد کے ہر شاعر نے کسی نہ کسی طرح ان کا اثر قبول کیا ہے اپنے طویل مقالے صبا در بدر میں انہوں نے میر تقی میر کے بارے میں لکھا ہے شاعر کو تلمیذ رحمانی بھی کہا گیا ہے اور پیغمبر کا درجہ دیا گیا ہے لیکن میر تقی میر تنہا شاعر ہیں جن کو خدائے سخن کہا جاتا ہے ولی دکنی' سودا' نظیر اکبر آبادی' انیس' غالب اور اقبال کے ہوتے ہوئے میر اردو شاعری میں عظمت کے تنہا پسند نشیں نہیں ہیں اور نہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اردو کے سب سے

بڑے شاعر ہیں پھر بھی اس صفت سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو کے تمام شعراء میں سرفہرست میر کا ہی نام رہے گا حالانکہ آج عام مقبولیت کے اعتبار سے غالب اور اقبال' میر سے کہیں آگے ہیں ان کی کتابیں کلیات میر کے مقابلے میں بہت زیادہ فروخت ہوتی ہیں ان کے اشعار زیادہ زباں زد ہیں اور ان کے اثرات جدید شاعری پر زیادہ نمایاں ہیں پھر بھی غالب اور اقبال کی شاعری کے زیادہ منکر موجود ہیں مگر میر کی استادی سے انکار کرنے والا قطعی کوئی نہیں ہر عہد میں بڑے سے بڑے شاعر نے اپنا سر میر کی بارگاہ میں جھکایا ہے۔''

(صبا در دبدر از سردار جعفری)

سردار جعفری کے انداز نقد پر سربر آوردہ ترقی پسند تنقید نگاروں نے خوب گفتگو کی ہے ان کے اس انداز کو سراہا ہے کہ انہوں نے قدیم ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی بازیافت کی ہے کبیر' میرا کی شخصیت ان کے جذبہ تصوف و بھگتی پر سردار جعفری نے بہت دل کش انداز میں روشنی ڈالی ہے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کہا تھا کہ ایسا نہیں کہ وہ صرف ایرانی ادب یعنی قدیم فارسی کے بحرِ بے کراں کے شناور تھے وہ ہندوستان کی قدیم ثقافت یہاں کے متنوع تہذیبی رنگوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے وہ اچھی طرح اس بات کو سمجھتے تھے کہ اگر اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو ایک عظیم الشان تہذیب سے چشم پوشی کے مترادف ہوگا۔''

انہوں نے اپنی تحریروں میں غالب کی بھی اس نقطہ نظر سے تعریف کی ہے ان کی مشہور فارسی مثنوی چراغ دیر کا انہوں نے اُردو میں ترجمہ سومنات خیال کے نام سے کیا تھا اس میں ایک مبسوط دیباچہ بھی انہوں نے لکھا ہے ایک طویل اقتباس پیش ہے۔

''غالب کا ایک فارسی شعر ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ میرے سومنات خیال میں آؤ اور دیکھو کہ کیسے کیسے دل آویز اور روح افروز پیکر یہاں آراستہ ہیں جن کے دوش زنار سے سجے ہوئے ہیں' غالب نے اس عبادت گاہ کو اپنی شاعری کا سومنات خیال کہا ہے اور اسے خوں نابہ فکر کے دائرے سے بھی باہر نکال لیا ہے ایک نیا وقار عطا کیا ہے جس میں عقیدے کا دخل نہیں ہے بلکہ ایک غیر مذہبی فکر کی کارفرمائی ہے یہ بات بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے کہ غالب نے اپنی شاعری کو سومنات خیال کیوں کہا اس کی کسی تحریر سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔''


﴾بہاولنگر میں مقیم﴿

ممتاز شاعر اور افسانہ نویس گل زیب عباسی

کا تازہ شعری مجموعہ

**درد فصیل**

طباعت کے آخری مراحل میں

صفحات 144 ' قیمت 300 روپے

ناشر: مکتبہ فجر۔15/6 فضل سٹریٹ

بج پیر روڈ' نیو مزنگ۔لاہور


معزز قارئین۔آداب!

**کچھ باتیں:**

ہم نے ماہ نامہ ادب لطیف کا 80 سالہ نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

اور یہ ذمہ داری مظہر سلیم مجوکہ کو دی ہے۔ ان کا فون نمبر 0321-4377794

پوسٹل ایڈریس: کتاب دوست فیروز سنٹر غزنی' سٹریٹ اُردو بازار لاہور

ایڈیٹر: صدیقہ بیگم

39-گرین ایکرز رائے ونڈ روڈ۔لاہور

فون نمبر: 35321692

ماہ نام ادب لطیف کا ذیلی دفتر

محمد خالد چودھری بابائے اُردو بازار لاہور 0300-4112009 -0333-1421820

چودھری ظفر علی' چودھری اکیڈمی الفضل مارکیٹ' اُردو بازار لاہور فون نمبر 37233449

email: kitabvirsa@gmail.com

# علی رضا کا مجموعہ ''مفہوم'' نئے تناظر میں

بسمل صابری/ساہیوال

گھر کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ نوجوان شاعر علی رضا بہت محبت اور خلوص کے ساتھ اپنا شعری مجموعہ ''مفہوم'' لئے میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے اپنا مجموعہ کلام مجھے یہ کہتے ہوئے تھمایا۔ کہ 15 نومبر کو اس کی تقریب میں آپ کو ضرور آنا ہے میں نے ہاں کر دی اور شرکت کا وعدہ کر لیا۔

علی رضا میرے بچوں جیسا ہے میں نے اُسے غالباً 1985ء میں ایک بہت بڑے اجتماع میں جو ساہیوال کی انتظامیہ کی طرف سے انعقاد پذیر ہوا تھا۔ اُس میں حضور اکرم ﷺ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے سُنا تھا۔ اُس وقت وہ ایک سکول کا طالب علم تھا۔ اُس نے بہت خوش الحانی سے یہ نذرانہ عقیدت پیش کیا تھا۔

پاکستان کے شعراء کا انداز نظر اور فکر وفن کے زاویے لاکھ بدلیں۔ لیکن حضور ﷺ کے ساتھ اُن کی عقیدت وشیفتگی کے قرینے ہرگز نہ بدلیں گے۔ پھر میں نے متعدد بار اُسے شعر وسخن کی محفلوں میں بھی سُنا۔ میں جان چکی تھی ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

''مفہوم'' سے اُس کی حمد کا شعر ملاحظہ ہو۔

وہی تو ہے جو مرا سہارا ہے زندگی میں
کبھی جو میں لڑکھڑاؤں مجھ کو سنبھالتا ہے

علی رضا جیسے محنتی اور باہمت نوجوان کے مجموعہ کلام کو پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے اُس نے زندگی کا ''مفہوم'' پا لیا ہو اُس کی شاعری اُس کے قلبی' ذہنی' فکری' زمینی حقائق اور معاشرہ جس میں وہ زندہ ہے۔ ایک دم وہ شکل کے سامنے آ جاتی ہے۔ جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ شاعر ہمیشہ لفظوں میں زندہ رہتا ہے اور لفظوں سے ہی فیض پاتا ہے۔ علی رضا نے اپنے بارے میں معاشرے کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے اُس کی حمد' نعت اور غزل سراسر جو کچھ بھی میں نے زیرِ نظر مجموعہ کلام میں پڑھا۔ اُس کے مطالعہ سے میرے قلب ونظر کی رَوشوں پر انبساط کے گلاب کھلتے اور روح کے آنگن میں تمناؤں اور خوابوں کی تعبیر سکون وراحت بن کر تراوش کرتی نظر آئی۔ یہ بات میں نہایت سچائی اور دیانت داری سے کہہ رہی ہوں۔ کہ ایک اچھا غزل گو شاعر ہی ایک اچھی نعت کہہ سکتا ہے نعت تو شاعر کی عقیدت اور اُس کی واردات قلبی کا نذرانہ افراط وتفریط کی دُھول سے جتنا منزہ ہوگا اُتنا ہی وہ حضور پاک کے ہاں مقبول اور مُستحسن ہوگا۔

نعت کا شعر دیکھئے۔

ساحل پہ مقدر کا سفینہ نہیں دیکھا
سرکار ابھی میں نے مدینہ نہیں دیکھا

میں یہ سمجھتی ہوں یہ سب توفیق الٰہی کی بدولت ہی ممکن ہے اُس کی مدحت سرائی میں نطق وگویائی میں وسعت کی طلب روضہ رسولؐ کے دیدار کی تڑپ۔ یہ مضامین تمنا محبت وعقیدت شوق وعشق انکساری و نیاز مندی کے آبدار موتی شاعر خوشنوا اپنے دھڑکتے دل لرزتے ہونٹوں۔ اور نمناک آنکھوں سے پیش کرتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اُس کی اس محبت اور عقیدت میں بیشی ہوگی اُس کی زندگی کے تجربات نکھو کے محسوسات اور اپنے ہونے کا اعلان اس ناپائیداری' سماجی اور سیاسی' علمی وفکری رویوں سے اُس کی وجدانی کیفیات میں مزید اضافہ کا باعث بنیں گے۔ اس کی شاعری ایک تازہ ہوا کا جھونکا سہی۔ لیکن جہاں سے میں ایک ذہین شاعر جس کا رابطہ اور نقطہ نگاہ خدا۔ اِنسان اور کائنات کی مثلث سے ہی جڑا ہوا ہے۔ وہ آنے والے کل میں آج کے دَور کے نوجوان شعراء کی صف میں حال اور مستقبل کی غزل کو سمونے کا ایک شعری حوالہ بن جائے گا۔

میں کہا کرتی ہوں۔ لوگوں سے شہر بڑے ہوا کرتے ہیں۔ شہروں سے لوگ نہیں۔ اُس کی غزل میں بے شمار ایسے امکانات روشن نظر آتے ہیں کہ مضافات میں اچھا شعر وادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اُس کا یہ شعر دیکھیں۔

یہ عام لوگ نہیں سرسری نہ دیکھ انہیں
یہ لوح دل پہ ترے خال وخد اُتارتے ہیں

یہ دیکھیں۔

ہم لوگ کسی طور بھی سرِخم نہیں رکھتے
کل کیسی سحر ہوگی کوئی غم نہیں رکھتے
تنہائی میں رو لیتے ہیں ہم کر کے تجھے یاد
محفل میں کبھی آنکھ کو پُرنم نہیں رکھتے

ہر شخص اِک فضائے خوف وخطر میں ہے علی رضا کے تجربات و مشاہدات محسوسات کے اور حوادث کی تلخی دردانگیزی سے لبریز ہے۔

تجھے علم ہے میں دیارِ فتنہ و شر میں ہوں
شب وروز ایک فضائے خوف وخطر میں ہوں

باذوق قارئین کرام کے لئے اُس کے شعری استغاثے میں بہت جان ہے۔ اس شترِ بے مُہار معاشرے میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اُسے اس کا مکمل ادراک ہے اُس کی شاعری خصوصاً غزل میں بھرپور تغزل موجود ہے۔ یہی حال اور مستقبل کی شاعری ہے جو اپنی روایت کو ساتھ لے کر آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دو شعر دیکھئے۔

اس زمانے سے فقط اتنا گلہ ہے مجھ کو
اس زمانے نے کبھی درد نہ جانے میرے

دیکھو مجھے میں تم سے مخاطب ہوں دوستو
لازم ہے میری بات بھی سمجھا کرے کوئی

شہر ساہیوال جسے میں شہر جمال بھی کہتی ہوں گو ایک مضافاتی شہر ہی سہی لیکن یہاں جو بھی اچھا شعر کہا گیا اُس کی سوندھی سوندھی سی خوشبو ملک کے طول وارض کے علاوہ بیرونِ ملک بھی پھیلتی چلی گئی۔

احمد فراز نے تو یہاں تک کہا ہے

''کہ کسی شاعر کا ایک اچھا شعر بھی اگر انسانوں کے حافظوں پر نقش ہو جائے تو وہ شاعر لوگوں کے دلوں میں بستا ہے۔ چہ جائیکہ کہ پچاس یا سو مجموعہ ہائے کلام جو حبس زدہ الماریوں کی زینت بن جائیں''

زمانے کی اس تپتی اور جُھلستی بھٹی سے کندن بن کر شاعر کو کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے کیا کہنا ہے۔ شاعر کو اس کا مکمل ادراک ہو جاتا ہے۔ تبھی تو وہ اچھی شاعری وجود پاتی ہے۔

علی رضا نے نہایت خوبصورتی سے اس خیال کا اظہار اس پیرائے میں کیا ہے۔

اب جسے پاؤں تلے روندتا پھرتا ہوں رضا
کل سما جانا ہے چپ چاپ اسی خاک کے بیچ

اس جبر کے موسم میں بھی اُسے سچی شاعری کا حوصلہ جو اسمِ محمدؐ کی پناہوں میں اُسے نصیب ہوا اللہ کرے وُہ جاری وساری رہے۔ جس ہنر مندی اور متانت سے ہر دلعزیز اور نفیس احساسات و جذبات کو غزل کے کینوس پر منعکس کرتا ہے اور اعلٰے اور ارفع درجہ کی نعت میں سموتا ہے۔ ''مفہوم'' کے بعد بھی وہ بلندی کی مزید منزلیں طے کرے گا۔

کچھ اشعار دیکھیں۔

بروزِ محشر ضرور ہوگی شفاعت اپنی
کہ ہم سے عاصی درِاماں تک پہنچ گئے ہیں

یہ اُس کی دُھن ہے کہ حدِ امکاں نگاہ میں ہے
کہاں سے ہم اے رضا کہاں تک پہنچ گئے ہیں

پھر دیکھئے۔

ظاہر ہی سے اندازہ لگانا نہیں اچھا
چہرہ ہی نہیں عظمت کردار بھی دیکھو

.........

خوشی کے لیے بہت مختصر ملے ہیں رضا
میں ٹوٹ پھوٹ گیا اب کے عید کرتے ہوئے

اندھی نفرت کسی کھوکھلی زندگی کو معنی اور مقصد دیتی ہے اس بے معنی زندگی سے اُکتائے ہوئے لوگ ہی کسی عظیم مقصد کے لئے اپنے آپ کو قربان ہی نہیں کرتے بلکہ شکایت کے لئے نئے نئے معنی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قوت برداشت اور امن کا پرچار کرتے ہیں۔ اور امن قائم کرنے کے لئے مضبوط رہنے کے لئے نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ میں تو زندگی میں انسانیت کے پرچار کو ہی زندگی کا زیور سمجھتی ہوں۔ یہ وہ خود آگاہ لوگ ہیں جو کسی خود فریبی کا شکار ہوئے بغیر فن کی راہوں پر عزم و ہمت لئے گامزن ہو جاتے ہیں۔ شاعری تو سراپا حُسن ہے۔ سراپا خلوص ہے۔ محسوس کرنے کی چیز ہے۔ معاشرے کی ناہمواریوں سے پیدا ہونے والا کرب ہی شاعر کو خود آگہی کی دولت فراہم کرتا ہے۔

''مفہوم'' سے شعر دیکھئے۔

یہیں جینا یہیں مرنا مری مجبوری ہے
مری خوشیاں مرے آنسو ہیں اسی خاک کے بیچ

میرے ہمراہ رواں ہیں زمانوں کے ہجوم
میں اکیلا تو نہیں وسعتِ افلاک کے بیچ

ہر شاعر اپنے تجربات و مشاہدات اور واردات قلبی کو اپنے پیرائے میں سمو کر زندگی کی کیفیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ اپنے وجود میں ٹوٹنے سے جذباتی رجحان اور نفرت پیدا ہوتی ہے اس وجود سے منہ موڑ کر ہم دوسروں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا جسے حق حاصل کر لیتے ہیں۔

علی رضا کا شعر دیکھیے۔

اُدھر چلے ہو تو کہنا میری طرف سے اُسے
کہ جی رہا ہے رضا زندگی سے ہار کے بھی

کسی ڈار سے بچھڑا ہوا رضا کسی بھی خوش فہمی کا شکار نہیں۔

نہ ہی وہ کسی زعم میں مبتلا ہے بلکہ وہ زندگی کا مفہوم جان چکا ہے جس ڈگر پر وہ چل پڑا ہے اُس کی عاجزی مذہبی آگہی اور دلبری کی یہ ادا مجھے بہت بھلی لگی۔

چلو کہ پچھلی سبھی رنجشیں بھلا ڈالیں
اب اسقدر بھی نہیں ٹھیک سرگرانی بہت

یہی آگہی اُسے شاعری کا دلآویز پیرہن عطا کرتی ہے اُس کے فکری اور فنی دونوں پہلوؤں کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ اللہ کرے وہ زندگی میں مزید ترقی کرے آمین۔

# اعزاز احمد آذر مرحوم۔ کچھ یادیں

ممتاز راشد لاہوری

مئی 2015ء کی ایک صبح کو میں نے حسب معمول لیپ ٹاپ کھول کر فیس بک کی اپنی ٹائم لائن کی تصاویر وغیرہ دیکھنا شروع کیں تو یہ اندوہناک خبر پڑھنے کو ملی کہ اعزاز احمد آذر وفات پا گئے ہیں اور پھر دُنیا بھر کے اہل قلم کے تعزیتی پیغام بھی فیس بُک پر آنے لگے۔موبائل فون پر آنے والے پیغامات سے بھی اندازہ ہُوا کہ ان کی وفات کی خبر جنگل میں آگ کی طرح دنیائے ادب میں ہر سُو پھیل گئی ہے۔ ایک پیغام میں ان کے برادر خورد اور معروف ادیب افتخار مجاز نے ان کے جنازے کے بارے میں تفصیل بتائی تھی۔ اسلام عظمی کا فون آیا کہ میں بھی جنازے پر آپ کے ساتھ چلوں گا۔ وہ ایک بجے آصف بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں میرے ہاں آ گئے اور ہم وہاں سے ہما بلاک کی طرف روانہ ہوئے جو اسی بستی میں میرے گھر سے دو کلومیٹر دور واقع ہے۔ ان کے گھر کے باہر اہل قلم کی کثیر تعداد جمع تھی۔ قریبی ڈونگی گراؤنڈ میں جنازہ ہُوا جس میں بیسیوں اہل قلم شریک تھے۔ اسی طرح قریبی جامع مسجد میں اگلے روز رسم قل میں بھی ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ جو مرحوم کے بھائی افتخار مجاز اور مرحوم کے بیٹے حسن اعزاز سے افسوس کا اظہار بھی کرتے رہے۔

اعزاز احمد آذر مرحوم نے کئی حوالوں سے شہرت کمائی۔ بہت ہی اچھے شاعر تھے' بہت ہی عمدہ مضامین لکھتے تھے۔ کالج میں پڑھاتے بھی رہے۔ ٹی وی اور ریڈیو کے کئی پروگراموں کی نظامت کی۔ بے شمار مشاعرے پڑھے۔ پی ٹی وی سے مہینوں تک ''کتاب'' نامی پروگرام پیش کرتے رہے جس میں نئی کتب کا تعارف ہوتا اور ان پر گفتگو ہوتی تھی۔ پاکستان نیشنل سنٹر کے تحت سیالکوٹ اور لاہور میں کئی یادگار پروگرام کیے۔ یہ ادارہ بند ہوا تو اہتمام کے ساتھ اس کی لائبریری کی کتب اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری کا حصہ بنا دیں حالانکہ ان کے خریدار بھی کم نہ تھے۔ مجھے اعزاز احمد آذر مرحوم کے ساتھ کچھ مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ وہ اپنے کلام پر خوب داد حاصل کرتے تھے۔ ان کے فکری اشعار کا تناسب بھی خاصا ہوتا تھا۔ میں نے مدھیہ پردیش انڈیا کے ماہنامہ ''انتساب'' میں ''لاہور کے شعراء'' کے عنوان سے مضمون لکھا جس میں ان کا ذکر بھی تھا۔ انہوں نے ایک دوست کے ذریعے شکریے کا پیغام بھیجا۔ تب میں دوحہ قطر میں مقیم تھا۔ ایک بار لاہور آیا تو ساحل ہاشمی نے شاہدرہ کے ایک سکول میں مشاعرہ رکھا۔ آذر مرحوم وہاں فاطمہ غزل کے ہمراہ آئے۔ میں نے پہلی بار انہیں وہیں سنا۔ پھر ''تارکین وطن'' کے مدیر اعلیٰ میاں منظور شاہد کے دفتر (کشمیر بلاک) میں مرحوم کے بھائی افتخار مجاز کے ساتھ کافی نشستیں رہیں تو اکثر مرحوم کا تذکرہ ہوتا۔ غالباً 2012ء میں ''سینا'' (شادمان کالونی لاہور) کے مشاعرے میں ان کے ساتھ پڑھنے کا اعزاز ملا۔ اس سے قبل روزنامہ ''خبریں'' نے شمالی علاقوں میں زلزلے کے حوالے سے مشاعرہ کیا تو ان کو بھی سنا اور پہلی بار ان کے صاحبزادے حسن اعزاز کو بھی۔

اپریل 2015ء میں آفتاب خاں کے شعری مجموعہ ''شام'' کی رونمائی الحمراء لاہور میں ہوئی تو وہ شدید علالت کے باوجود آئے اور بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور شگفتہ انداز میں تقریر کی۔

آخری بار انہیں اپریل ہی میں ''تارکین وطن'' کے دفتر میں ملنے کا موقع ملا۔ وہاں کراچی سے آئے ہوئے کالم نگار سعید پرویز کے لئے میاں منظور شاہد اور افتخار مجاز صاحب نے استقبالیہ رکھا تھا۔ آذر مرحوم کی طبیعت اس روز بھی ناساز تھی مگر شریک ہوئے اور سعید پرویز اور ان کے بھائی نامور شاعر انقلاب حبیب جالب مرحوم کے حوالے سے مفصل گفتگو کی۔ بس اس تقریب کی چند روز بعد ہی ان کی وفات کی جانکاہ خبر آ گئی۔ اللہ انہیں رُوح کی آسودگی بخشے۔

❁❁❁

ممتاز نوجوان شاعر خادم علی انجم
کے پہلے شعری مجموعے
**''محبت کس سے کرتا میں''**
کا دوسرا ایڈیشن مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا۔
ناشر: نستعلیق مطبوعات' اُردو بازار۔ لاہور

# لاہور میں چینی ادیب و شاعر

ڈاکٹر غافر شہزاد/ لاہور

حکومت پاکستان نے چینی اور پاکستانی ادیبوں وشاعروں کی دوستی بڑھانے کے لئے اکادمی ادبیات پاکستان کے تعاون سے لاہور میں دوروزہ کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اصغر ندیم سید نظامت کر رہے تھے جبکہ ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ کانفرنس میں حاضرین کی تعداد بے شمار تھی اور اس میں لاہور کے نمائندہ شاعر ادیب بھی موجود تھے مگر اس کے باوجود مجموعی تاثر یہی تھا کہ معلوم نہیں یہ کون لوگ تھے' کہاں سے آئے تھے وران کا ادب سے کوئی تعلق تھا بھی کہ نہیں۔ یہ نیم ادبی لوگ جو اچھے ہوٹلوں میں تقریبات کرتے ہیں' کانفرنس میں ان کی بھرپور شرکت تھی۔ یہ مہمانوں کے ساتھ تصاویر بنوا رہے تھے اور ساتھ ساتھ فیس بک پر اپ لوڈ بھی کر رہے تھے۔ اگلی نشستیں انہوں نے ہی سنبھال رکھی تھیں۔ دوسرے روز کے ادبی اجلاس 1 کی صدارت انتظار حسین نے کی مگر سیشن کے درمیان میں ہی گورنر صاحب کے آنے' صدارتی خطبہ دینے اور پھر چلے جانے کے عمل نے تقریب میں بھگدڑ مچائے رکھی۔ اس وجہ سے سیشن لیٹ اختتام پذیر ہوا مگر کیا کریں حکومتی تقاضے بھی تو کچھ ہوتے ہیں۔ انتظار حسین نے کانفرنس کے بنیادی تھیم سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ مشرق میں روحانیت تلاش کرنے والوں کو ہند' ایران اور چین کی صدیوں پرانی تہذیبیں کیوں دکھائی نہیں دیتیں۔ شاعری میں تو روحانیت کی بات ہو سکتی ہے مگر نثر تو خالصتاً سیکولر ہوتی ہے۔ ایک مقالہ نگار نے پاکستانی شاعری میں علامت نگاری کے حوالے سے کہا کہ احمد فراز کے بعد نظم میں علامت کہیں اور نظر نہیں آتی۔ مزاحمتی شاعری کے حوالے سے جامی چانڈیو نے جنرل ضیاالحق کے مارشل لا دور کا شکریہ ادا کیا کہ جس کے سبب مزاحمتی ادب سندھ میں تخلیق کیا جاسکا۔ کانفرنس کے ادبی اجلاس 2 میں چین اور پاکستان کے ادیبوں کے وفود کا تعارفی سیشن رکھا گیا اور مکالمہ کروایا گیا۔ نہایت غیر متعلقہ اور موضوعات سے ہٹ کر سوالات کرنے کے سبب مکالمے کی فضا مکدر ہوئی۔ کشور ناہید نے ایک چینی ادیب کے کہنے پر کہ ان کو ادب میں نوبل انعام بھی دیا گیا' اس کا نام پوچھ لیا مگر جواب نہیں ملا۔ اس پر کشور ناہید کا کہنا تھا کہ وہ چینی ادیب چین میں تو رہتے نہیں ہیں جن کو نوبل انعام دیا گیا۔ اس سیشن میں قاسم بگھیو کی صدارت تھی مگر وہ بہت بے بس نظر آئے۔ خاص طور پر کہ جب مترجم چینی زبان میں بات کو دہراتا تو لوگ آپس میں باتیں کرنے لگتے۔ لوگ اس لیے کہ یہاں ادیب نما لوگوں کی کثرت تھی۔ تبسم کاشمیری نے سوال پوچھا کہ چینی ادب میں عشق کے معاملات کیوں نہیں ملتے۔ امجد اسلام امجد نے پوچھا ان کے ڈرامے وارث کے بعد کوئی اور پاکستانی ڈرامہ یا فلم کیوں چینی زبان میں ڈب نہیں ہوئی۔ ادبی اجلاس 3 کا موضوع رومانیت اور طبقاتی تضادات تھا جبکہ شام کو ظفر اقبال کی صدارت میں مشاعرہ کا انعقاد بھی کیا گیا۔

## طمانچہ

دولت کی اس منڈی میں
غرض کی اندھی نگری میں
ہر چیز ہی بکتی آئی ہے
ہر شخص کا سودا ہوتا ہے
ہر جذبہ رُسوا ہوتا ہے
سکوں کی جھنکار میں دب کر
عزت' شہرت' غیرت سب کچھ
اپنی شکلیں کھودیتے ہیں
اپنے آپ کو رو دیتے ہیں
غرضوں کے بازار میں لوگو!
لے کر چیز وہ آیا ہوں
آج سے پہلے جسے کسی نے
بیچا اور نہ خریدا ہوگا
سب کو شاید فائدہ ہوگا
اچھے بھاؤ بکوں بھی تو
مجھ کو تو بس گھاٹا ہے
(یہ کس نے وقت کے خنجر سے
آس کی ڈور کو کاٹا ہے)
خود کو بہت تھا روکا مَیں نے
لیکن پھر بھی آ ہی گیا
غرض کے در پہ سر کو جھکا کر
اپنے آپ سے آنکھ چرا کر
جیون رُت کے سارے بچے
بیچنے بیچنے آیا ہوں مَیں
مجھ سے میرے بچے لے لو......
مجھ کو لیکن روٹی دے دو
غرضوں کے بازار میں لوگو!
بچے بیچنے آیا ہوں مَیں

بدر سیماب

# بُرقع (انشائیہ)

غلام مصطفےٰ مغل/ اوکاڑا

جہاں نامور مسلمان سائنسدانوں نے نت نئے تجربات سے بے شمار ایجادات کیں وہیں ناموسِ زیست کا محافظ برقع بھی مسلمانوں کی اہم ایجاد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسلامی تہذیب میں خواتین کا بیرونی پیراہن ہے۔ بالخصوص اس کا استعمال پردے کے روپ میں ہوتا ہے۔ اس طرح کا پردہ دنیا کے تمام مسلم گروہوں میں پایا جاتا ہے۔ البتہ الگ الگ مقامات میں الگ الگ نام سے پردہ کا اہتمام ہورہا ہے۔ برقع، عرب ممالک اور برصغیر میں استعمال عام ہے۔ اس وسیع عریض مرقعٔ حجاب کی صحیح تاریخ تولد کا تو علم نہیں ہو سکا البتہ مورخین وماہرین آثار قدیمہ کی غیر محتاط صحرا نوردی سے پتہ چلتا ہے کہ پردہ یعنی برقعے کا وجود قبل از زمانہ جہالت بھی موجود تھا۔ کہتے ہیں بے حجابے راہ روی اور دین حق سے دوری کے باوجود اہل یونان کے ہاں پردے کا تصور موجود تھا یہاں تک کہ ان کے گھروں میں زنان خانے مردان خانوں سے الگ ہوتے تھے۔ یونان کے بعد جس قوم کو عروج نصیب ہوا وہ اہل روم تھے، روما کے ہاں بھی کہیں کہیں پردے کا تصور موجود تھا۔

قوموں کے عروج و زوال اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ براعظموں کیطرح برقعے میں بھی بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں آخر کار اپنی جامع حیا داری کے ساتھ ترکوں میں پرورش پائی۔ دراصل دین اسلام نے انسانی شرم حیا کی جس قدر صحیح اور مکمل نفسیاتی تعبیر کی ہے اسکا جواب دنیا کے کسی مذہب یا تہذیب میں نہیں ملتا۔ اسلام کی نگاہ میں زینت سے زیادہ ستر پوشی کو اہمیت دی گئی ہے اسلام نے چونکہ عورت کو عزت کی نگاہ بخشی، احترام کا درجہ دیا اور پردہ کا حکم فرمایا۔ سورہ نساء آیت نمبر 34 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے: صالح بیویاں شوہروں کی اطاعت گزار اور اللہ کی توفیق سے شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کی ناموس کی محافظ ہیں۔ اسلام کی نگاہ میں وہ لباس۔ لباس نہیں جس سے بدن جھلکے اور ستر نمایاں ہو۔ سورۃ الاحزاب آیت نمبر 59: اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے مونہوں پر نقاب ڈالا کریں یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ پہچانی جائیں پھر نہ ستائی جائیں اور اللہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ﷺ فرماتے ہیں "لعن اللہ الکاسیات والعاریات" اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی ننگی کی ننگی رہیں۔ اسلام میں چونکہ حیا عورت کا بہترین زیور قرار دیا گیا ہے اور برقعہ حیا کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

برصغیر پاک ہند میں تو برقعے کو خاص اہمیت حاصل تھی حتہ کہ شرفاء و روساء کی نجی محافل اور شاہی محلات میں رقص و سرود کی محفل سجانے والیاں بھی شرم و حیا کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کیلئے برقعے اور پالکی کا کثرت سے استعمال کرتی تھیں تا کہ بازار سے گزرتے ہوئے کسی محرم کی نظر نہ پڑ جائے ویسے بھی برقعہ ہماری تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی روایات کا اہم رکن ہے۔ برصغیری تہذیب میں لکھنوی بانکے اگر کسی رنڈی کے کوٹھے پر گانا سننے بھی جاتے تو چوڑی دار پاجامہ کے ساتھ سر پہ ٹوپی ضرور پہنتے اور گھروں پر اگر زنان خانے میں مرغا بھی گھس آتا تو مستورات جھٹ سے منہ پر پلو اوڑھ لیتیں۔

ہمارے ہاں برقعہ صرف ستر پوشی کیلئے ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ روزمرہ زندگی میں حجاب کے اس پیکر سے دنیا جہان کے بے شمار ممکن و ناممکن کام لئے جاتے ہیں۔ بانسبت دوسرے صوبوں کے پنجاب میں ریونیو کی ادائیگی بدرجہ اتم موجود ہے سو غریب عوام وسائل کی کمی اور مسائل کی بہتات کے باوجود بہ مجبوری ہر ماہ کے اوائل ایام میں بنکوں کے آگے قطار اندر قطار ہاتھوں میں ٹیکس چالان فارموں کے علاوہ بجلی، ٹیلی فون، گیس اور پانی کے بل تھامے یوں بیتابی سے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں جیسے ابھی ابھی انہیں قارون کا خزانہ ہاتھ میں لگنے والا ہو۔ البتہ کچھ صاحب دانش اور عیار لوگوں نے زحمت سے بچنے کیلئے برقعے کا استعمال کیا جس سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے یہاں تک کہ گداگری جیسے رذیل پیشے میں بھی برقعے کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے حتہ کہ معصوم و بے گناہ لوگوں کے ناحق قتل اور ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی میں بھی برقعے کا اہم کردار ہے۔ اور کچھ لوگوں نے اپنے مذموم مقاصد کیلئے برقعے کا استعمال بڑے احسن طریقے سے کیا کہ بے زبان برقعہ خود محو حیرت اپنے وجود کو کوس رہا ہے۔ جیسے ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں سو دوسری طرف دیکھا جائے تو سائنسی ترقی بھی برقعے ہی کی مرہون منت ہے۔ بیڈمنٹن کی شٹل کاک ہو یا ناسا کی خلائی شٹل یہاں تک کہ اہرام مصر بھی برقعی طرز تعمیر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ موصوف ہمہ جہت شخصیت کا مالک ہے، محافظ ناموس، اپنے حدود اربع اور وجود بیکراں کی بدولت ہفت اقلیم کو بھی اپنے سایہ حیا میں سمونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ جیسے مرغی اپنے فطری وغیر فطری بچوں کو آفت ناگہانی پر مامتائی

دامن میں چھپا لیتی ہے۔ برِ اعظموں میں جغرافیائی تبدیلیوں کی طرح ضرورت وقت اور ذرائع ابلاغ کے سبب برقعہ کی حیثیت میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں اور رفعت زیست و زیبائش کیلئے نت نئے روپ میں سامنے آیا۔ ویسے روایتی برقعہ اور کفن ہی دو ایسے لباس ہیں جنہیں پہن کر انسان دنیا و مافیہا سے کٹ کر رہ جاتا ہے نہ اندر کی خبر نہ باہر کا پتہ چلتا ہے۔ انواع و اقسام کے اعتبار سے برقعوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو چھپاتا ہے اور دوسرا وہ جو چھپتا ہے۔ اگر دونوں کا حیائی تقاضوں کے زاویہ نظر سے تقابل کیا جائے تو پہلے اقسام کے برقعے ماڈرن برقعوں کے آگے خمیدہ سر نظر آتے ہیں یعنی پہلی قسم میں سادہ و معصوم بھولے بھالے بھاری بھرکم جو اپنی وضع و قطع سے تصور قبر کا بہترین نمونہ قرار پائے ہیں یہ چاروں اور بند اور نیچے ایک عدد داخلی و خارجی راستہ ہے اوپر جکڑ بند سی ٹوپی جس میں نہ ہونے کے برابر ننھے منھے سے سوراخ اور گرداگرد چنٹوں سے مزین جھالردار گاگھرا نما برقع جو کسی ناگہانی افتاد، راہ چلتے نظر باز یا کتے کے ٹکونے پر پھن پھیلائے ایسے پھنکارتا ہے جیسے پٹاری میں شیش ناگ۔ ایسے دیو مالائی برقعے ہمسایہ ملک سرزمین اسلامی جمہوریہ افغانستان میں بکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں جسے سرِ راہ چلتی برقعہ بردار خواتین کسی نامحرم پر نظر پڑتے ہی ایک دم سمٹ کر ایسے بیٹھ جاتی ہیں جیسے کسی نے بڑ غالہ باندھ دیا ہو۔ بات مرقعے کے ہو رہی تھی تو ایک جنرل سروے کے مطابق اسلامی جمہوریہ افغانستان میں اسلام کو وہ حیثیت حاصل نہیں جو اہمیت برقعے کو حاصل ہے۔ حتہ کہ روشن خیال لوگوں کے گھروں میں بھی برقعوں کی بہتات ہے یہاں تک کہ اگر خدانخواستہ زنان خانے میں مرغا بھی گھس آئے تو خواتین مارے شرم کے جھٹ برقعہ اوڑھ لیتی ہیں۔ اور اب تو پار بحرہ ہند عربوں میں بھی جہیز کے اوپر برقعہ پہننے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ دوسری قسم کے برقعے جنہیں برقعہ کہنا برقعے کی توہین ہے۔ اپنی بے جا خوبصورتی اور ڈیل ڈول کی وجہ سے کسی بھی ہالی وڈ ایکٹرس کے کاسٹیوم سے کم نہیں۔ نامناسب اور چیدہ چیدہ جگہوں پر بے جا کڑھائی اور طلائی نقش و نگار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی جگہیں قابل حیا ہیں۔ جن میں موجود و عربی النسل کے برقعے پیش پیش ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا کہیں بیان کیا گیا ہے کہ ایسے فیشن ایبل برقعوں کے آگے اول اول ترکی النسل اور بھاری بھرکم زرہ بکتر نما برصغیری برقعے مارے شرم کے محجوب نظر آتے ہیں مگر یہ تو ماڈرن خواتین ہی بتا سکتی ہیں کہ کیا برا اور کیا زیادہ برا ہے۔ رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند"

ارکان اسلام کی طرح چونکہ برقعہ ہماری تہذیبی معاشرتی اور حیائی روایات کا اہم رکن ہے اس لئے اسے ضعیفی میں بھی پہننا معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ ہمارے یہاں برقعے کا استعمال ہی ضعیف العمری میں ہوتا ہے۔ اللہ بخشے ماسی نصیبن جسے کم و بیش محلے کے بوڑھے بھی ماسی ہی کہا کرتے تھے۔ انتہائی بڑے بوڑھوں سے مروی ہے کہ ماسی نصیبن عنفوان شباب میں ہی نیک سیرت اور باپردہ خاتون واقع ہوئی تھی۔ کہتے ہیں برقعہ ماسی نے بوقت عقد پہنا تھا اور بعد از بڑھاپا بھی خود سے الگ نہ ہونے دیا۔ یعنی اس قدیمی برقعے کی تار تار ٹوپی بدستور ان کے سر پر شاہانہ تاج کی طرح جلوہ افروز تھی اور پیچھے پیچھے برقع مور پنکھ کی طرح لہراتا رہتا تھا۔ ماسی اور برقعے کی رفاقت اتنی ہی پرانی ہے جتنی تاریخ آدم۔ برقعہ کثرت استعمال سے اس گھس چکا تھا کہ اس میں سے ماسی نصیبن کا بنیان کرتا تک نظر آتا تھا۔ ماسی اس قدیمی برقعے سے ہر ممکن و ناممکن کام لیا کرتی تھی کسی ضروری و غیر ضروری کام کیلئے باہر جانا ہو تو پردہ داری کے علاوہ اشیاء خورد و نوش اور سبزی تک برقعے کے پلو میں لائی جاتی۔ نماز کے لئے جائے نماز کی جگہ، ستانے کے لئے بچھونے کی جگہ، اکٹھا مٹھا کر کے تکیے کی جگہ اور رات مرغیوں کو سردی سے بچانے کیلئے ٹوکرے پر اوڑھا یا جاتا تھا۔ ماسی نصیبن چونکہ محلہ میں دینی و دنیاوی درس و تدریس کا کام بلا معاوضہ سرانجام دیتی تھی اور محلے کے تمام بچے بچیاں ماسی کو اپنی اولاد کی طرح پیارے تھے۔ سو جب بھی خیر سے غسل کا ارادہ فرماتیں تو ننھی منھی بچیاں دستی ہینڈ پمپ کے گرداگرد ایک طرف سندھی کھجور کے بان سے بنی چارپائی اور دوسری طرف شاہی حمام خانے کی طرح برقعے سے پردے کا اہتمام کرتیں جہاں تک کہ تولیے کی جگہ بھی برقعہ ہی استعمال ہوتا۔ جب کبھی پڑھتے پڑھتے کسی بچے کی ناک بہنے لگتی تو ماسی جھٹ برقعے کے پلو سے صاف کر دیتیں۔ کہا جاتا ہے قبل از بڑھاپا قدیمی برقعے میں ایک عدد نقاب بھی تھا جو کثرت استعمال اور وقت کی ریشہ دوانیوں کے سبب اب انسانی دم کی طرح جھڑ چکا تھا۔ جب سے محلے کے نوجوان بوڑھے اور بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تھے تب سے ماسی نے بھی نقاب ختنہ پہ توجہ دینا بند کر دی تھی یعنی نقاب کو بے نقاب کر دیا۔ چونکہ ماسی اور برقعے کا چولی دامن کا ساتھ تھا سو برسوں پر محیط رفاقت اور وفا شعاری کو امر کرنے کے لئے ایک تاریخی وصیت نامہ روبرو گواہان محلہ لکھوایا کہ بعد از مرگ مجھے میرے اسی خاندانی برقعے میں دفنا دیا جائے جس نے تاحیات میری ناموس کی حفاظت کی اور حیا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا تو اسی واسطے برقعہ آج بھی مسلمانوں میں اہمیت و افادیت کی بنا پر مقبول عام ہے۔

# میرے ابوّ

محمود ظفر اقبال ہاشمی/(سعودی عرب)

'کیا پوزیشن ہے پاکستان کی؟'

'ابو بہت بری حالت ہے.....نو وکٹ گر چکے ہیں.....جیتنے کے لئے ابھی بھی ۱۸۴ رنز چاہئیں!'

'یہ آخری دونوں کھلاڑی کون ہیں جو کھیل رہے ہیں؟'

'اقبال قاسم اور توصیف احمد!'

'فکر نہ کرو پاکستان جیت جائے گا.....دونوں کھلاڑی دیکھنے میں بہت تگڑے لگ رہے ہیں!'

اصولاً مجھے ہنسنا چاہیے تھا مگر میں حیرت سے منہ کھولے اپنے ابو کا منہ دیکھتا رہ گیا!

کرکٹ کی الف ب کی ذرا سی بھی سمجھ نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ کی طرح کمال کی امید انہوں نے چہرے پر سجا رکھی تھی۔ ان کا انداز اتنا غیر متزلزل تھا کہ میں ان سے بحث بھی نہ کر سکا اور نہ ہی یہ کہہ سکا کہ 'ابو! کرکٹ اور کبڈی میں زمین آسمان کا فرق ہوا کرتا ہے!'

میرے ابو تھے ہی ایسے!

ساری عمر اپنے ابو کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ مجھ پر یہ راز کبھی منکشف ہی نہیں ہوسکا کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ تیز ہوا میں دیا کیسے جلا لیا کرتے تھے۔ کمال یقین کے ساتھ عمر بھر انہوں نے غلط فیصلے کئے اور پھر خندہ پیشانی کے ساتھ انہیں یہ کہتے ہوئے قبول بھی کیا کہ 'کوئی بات نہیں.....ہو جاتا ہے.....ورنہ میں نے تو اپنی طرف سے سوفیصد درست فیصلہ ہی کیا تھا!'

مجھے ساری زندگی لفظ 'سادگی' اور اس کے مسلمہ اصولوں سے بھرپور اختلاف رہا مگر میرے ابو نے سادگی میں ساری زندگی کمال ہی کیا۔ ہر کسی پر یہ سمجھ کر یقین کیا کہ جیسے برسوں ملے ہوئے شخص کو وہ برسوں سے جانتے تھے۔ اس قدر محبت کے ساتھ دھوکہ کھاتے تھے کہ دھوکہ دینے والے کا دل بار بار انہیں دھوکہ دینے کو مچلنے لگتا تھا اور وہ ہر بار پچھلا تجربہ بھول کر دھوکہ دینے والے کا دل رکھ لیا کرتے تھے۔ جب تک رحیم یار خان ٹیکسٹائل مل میں سٹینو گرافر کی نوکری کرتے رہے محض چھوٹی موٹی دفتری سازشوں کا ہی شکار ہوئے۔ ان دفتری سازشوں میں سب سے قابلِ ذکر وہ تھی جس کے نتیجے میں انہیں اپنی پندرہ سالہ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اپنے دفتر سے جب آخری بار رخصت ہوئے تو سب سے زیادہ گرم جوشی کے ساتھ اس شخص کے ساتھ ملے جس کی سازشوں کے باعث ان کی نوکری گئی تھی۔ سادگی کی بیماری دراصل انہیں بچپن سے تھی۔ پورا بچپن انہوں نے اسی سادگی میں بسر کیا اور وہ اپنے والدین کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے ہونے کا فائدہ محض اپنی سادگی کے باعث نہیں اٹھا سکے۔ جب کبھی میری دادی جان ان کا بچپن یاد کرتیں تو یہ کہتے ہوئے ان کی ضعیف آنکھوں میں ایک عجیب سی فخریہ چمک آجایا کرتی تھی!

'چھوٹے ہوتے ہوئے صفدر بہت پیارا بیٹا تھا.....جو دے دیتے چپ چاپ کھا لیا کرتا تھا اور جو پہنا دیتے چپ چاپ پہن لیا کرتا تھا.....مجال ہے بچپن میں اس نے کبھی ایک بھی فرمائش کی ہو یا بلا وجہ کبھی ستایا ہو.....مجھے یاد نہیں پڑتا کہ سوائے بیلنے سے آئے تازہ گرم گڑ کے اس نے کبھی کوئی شے اپنے منہ سے مانگی ہو!'

اور دوسری طرف میں تھا جو ساری زندگی اپنی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے ماسوائے پستول اپنے والدین کی کنپٹی پر رکھنے کے ہر حربہ استعمال کیا کرتا تھا اور فرمائش پوری نہ ہونے پر اپنے والدین کو نتائج بھگتنے کی سنگین دھمکیاں بھی دیا کرتا تھا۔ البتہ میرا اکلوتا بیٹا بالکل اپنے دادا پر گیا ہے۔ وہ اپنے دادا کی طرح اس فن سے بالکل نابلد ہے کہ اکلوتے بیٹے ہونے کا فائدہ کیسے اٹھایا جاتا ہے!

اپنے ابو کی ایک اور ایسی عادت تھی جس کی وجہ سے مجھے پورا بچپن کافی مشکلات درپیش رہیں۔ صفائی اور نفاست پسندی سے جتنا رومانس انہوں نے کیا اتنا شائد انہوں نے میری والدہ سے بھی ساری عمر نہیں کیا۔ ہر صبح جب وہ سکول جانے سے پہلے مجھے اپنی بائیسکل صاف کرنے کا حکم دیتے تو مجھے اپنی بائیسکل دنیا کی سب سے منحوس ترین شے لگنے لگتی۔ ہر روز نہانے پر تمام بچپن مجھے شدید

تحفظات رہے اور جب کبھی میرے ابو کا دھیان میرے جُوے ہوئے بالوں پر چلا جاتا یا میری والدہ یا دادی میرے نہ نہانے کے متعلق انہیں رپورٹ کر دیتیں تو میرے لاکھ احتجاج اور بہانوں کے باوجود وہ مجھے اپنا پسندیدہ دھاریوں والا پرانا کھلا کھلا پہنا کر خود ہی نہلا ڈالتے۔ نہلانے کے بعد بڑے فخریہ انداز میں مجھے جب یہ کہتے کہ دیکھو کیسا انڈے جیسا پیارا منہ نکل آیا ہے!' تو ناشتے کے وقت فرائی انڈے کی زردی میں مجھے اپنا چہرہ صاف نظر آیا کرتا تھا۔ خواہ مخواہ ہر وقت میرے ناخن اور حجامت چیک کرتے رہتے اور میری ہر شے کی ترتیب پر ان کی خاص نظر رہا کرتی تھی۔ صفائی کے متعلق ان کے خیالات اس قدر عجیب وغریب تھے کہ بقول میرے دادا جان جب وہ پانچویں کلاس کے طالب علم تھے تو حاصل پور کے پاس واقع اپنے سکول سے واپسی پر اکثر اپنی بائیسکل کھڑی کرتے اور راستے میں واقع مختصر کچی سڑک پر پڑی ریت اپنے ہاتھوں سے ہٹانے لگتے۔ راہ گیر ہمیشہ حیرت کے ساتھ ان سے پوچھتے' بچے! سڑک کے ارد گرد ریت کے ٹیلے ہیں، ریت ہٹانے کا کیا فائدہ ہوگا، ہوا چلے گی تو یہ راستہ پھر ریت سے اٹ جائے گا!' تو جواباً سادگی سے جواب دیتے' ریت میں میری بائیسکل ٹھیک طرح سے نہیں چلتی...... جو ریت کا کام ہے وہ ریت کرے گی، جو میرا کام ہے وہ مَیں کروں گا!'

اذان ہوتی تو ابو کی نظروں سے ادھر اُدھر ہونے کی میری ہر کوشش اکثر ناکام ثابت ہوتی اور مجھے اپنے ابو کے ساتھ ہر صورت نماز پڑھنے مسجد جانا پڑتا۔ بلاناغہ وہ مسجد جاتے ہوئے اور واپسی پر مجھ سے تمام نمازوں و رکعتوں کی تعداد، تیسویں سپارے کی مخصوص آخری سورتیں، چھ کے چھ کلمے، آیت الکرسی، دعائے قنوت باقاعدگی سے سنا کرتے۔ ہر بار سب کچھ درست سنانے کے بعد مَیں اس زعم کا شکار ہو جاتا کہ اب ابو دوبارہ مجھے کبھی تکلیف نہیں دیں گے مگر اگلی نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے ابو چند گھنٹے پہلے کی میری عمدہ کارکردگی مکمل طور پر بھول جاتے!

ٹیکسٹائل مل والی نوکری چھوٹنے کے بعد انہیں پے در پے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اس جیسی دوسری اچھی نوکری ملنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ سادہ مزاج تھے لہٰذا ان کی شدید خواہشیں بھی سادہ تھیں مثلاً ضلعی سیشن کورٹ میں سٹینوگرافر کی نوکری مل جائے، لیبر برادرز میں کوئی بھی نوکری مل جائے تاکہ سستے گھی، صابن ، راشن کی سہولت میسر ہو سکے وغیرہ وغیرہ لیکن جب کوئی صورت بر نہ آئی تو انہوں نے اپنی انا اور خواہشوں کو لپیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے ایک واقف وکیل کی مدد سے ضلعی عدالتوں میں ایک چھپر یل ڈالا اور ایک پرانی ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ گئے۔ چونکہ وہ لوہا کوٹنے کے اس کام میں بے حد ماہر تھے سو جلد ہی انہوں نے اپنا لوہا پوری عدالت کے وکیلوں، منشیوں اور عدالتوں کے اندر بیٹھے ہوئے جج حضرات میں منوالیا۔ ایک وقت ایسا تھا کہ صبح سے سہ پہر تک بغیر تھکے ہوئے کسی سخت جان لوہار کی طرح مسلسل لوہا کوٹتے رہتے اور اپنی صحت کا سودا انتہائی سستے داموں کرتے رہتے!

مَیں ان کا بڑا بیٹا ضرور تھا مگر میری نظر اپنے ابو کی طرح زمین پر کم اور خلاؤں پر زیادہ رہا کرتی تھی۔ مجھے کھلے آسمان پسند تھے، تنگ گلیاں اور بند راستوں سے مجھے بہت جلد وحشت ہونے لگتی۔ زندگی میں ہر رکاوٹ یا شکست کے بعد جب مَیں چیخنے چلانے لگتا تو ایسے میں اکثر مَیں اپنے ابو کی سادہ باتوں کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔ وہ ہر بار مخصوص انداز و الفاظ میں مجھے دلاسا دیتے۔

'کوئی نہیں اس دفعہ کام نہیں ہوا تو اگلی دفعہ ہو جائے گا...... مایوسی کی کیا بات ہے!'

'آج سے مَیں نے مغرب کی نماز کے بعد دو نفل حاجات پڑھنا شروع کر دیئے ہیں..... دیکھنا یہ مسئلہ تو سمجھو حل ہوا ہی ہوا انشاءاللہ!'

'فکر ہی نہ کرو..... دیکھ لینا ہمارے دن ضرور بدلیں گے...... سب ٹھیک ہو جائے گا!'

'یہ بھی کوئی مسئلہ ہے بھلا؟..... سو فیصد کوشش کرو اور باقی اللہ پر چھوڑ دو!'

مگر ان کا سب سے زیادہ دہرایا جانے والا جملہ ہوا کرتا تھا.....

'گھبرانا نہیں بیٹے..... مَیں تمہارے ساتھ ہوں!'

ایک فیصد امکان اور آدھے فیصد توازن پر ہزار سال قائم رہنے والا امید کا مضبوط پل وہ انجینئرنگ کے تمام اصولوں کو چیلنج کرتے ہوئے بڑی آسانی کے ساتھ تعمیر کر لیا کرتے تھے۔ میرے لئے اس سے بھی بڑا امتحان ان کی چند ایسی خواہشات تھیں جو انہوں نے نجانے کیوں صرف میری ذات کے ساتھ ہی باندھ رکھی تھیں!

'ابھی زندگی میں وہ سب کام تم نے کرنے ہیں جو میں نہیں کر سکا...... میں چاہتا ہوں تم مجھ سے بھی اچھے سٹینو گرافر بنو اور پھر اسی کی بنیاد پر تم لیور برادرز یا پھر سیشن جج کی عدالت میں سٹینو گرافر کی نوکری حاصل کرو جو میں باوجود پوری کوشش کے حاصل نہیں کر سکا..... میری خواہش ہے کہ تم نوکری کے ساتھ ساتھ آگے ضرور پڑھو...... میں تو میٹرک سے زیادہ نہیں پڑھ سکا مگر تم نے ایم اے ضرور کرنا ہے...... ایم اے کرنے کے بعد میری خواہش ہے کہ تم باہر کے ملک میں جا کر نوکری کرو...... اپنا ایک اچھا سا گھر بناؤ جو میں اپنے غلط فیصلوں کی وجہ سے گنوا بیٹھا..... اور ہاں ہماری اپنی گاڑی ضرور ہونی چاہیے..... میں چاہتا ہوں کہ ایک دن میں اپنے بیٹے کے ساتھ گاڑی کی اگلی سیٹ پر فخر کے ساتھ بیٹھوں!'

اور کبھی کبھار جب وہ بہت خوش گوار موڈ میں ہوتے اور میری والدہ آس پاس نہ ہوتیں تو سرگوشی میں وہ اپنی ایک بہت خاص خواہش کا اظہار ضرور کرتے!

'جس خاندان میں میں شادی کرنا چاہتا تھا اس خاندان کی کسی لڑکی کو میں اپنی بڑی بہو کے طور پر دیکھنا چاہتا ہوں!'

زندگی ٹائپ رائٹر کے ربن کی طرح گھومتی رہی مگر جب اس کے ہر چکر میں ابو کی کھانسی کی آواز گونجنے لگی تو مجھے سوچنا پڑا!

دھان پان کی جسامت رکھنے والے اپنے ابو کو اکیلے محنت کرتے، اپنے کنبے کے مشکل حالات اور اپنی صحت سے تنہا لڑتا دیکھ کر سب سے پہلے میں نے نیشنل کالج آف آرٹس لاہور سے فائن آرٹس تعلیم حاصل کرنے والے اپنے سنہرے خواب کو خاک برد کیا اور میٹرک کے بعد میرے خوابوں کا سفر شہر کے پرانے کامرس کالج کی پسماندہ عمارت اور اس کی دیمک زدہ دہلیز پر ختم ہوا۔ میں نے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ مضامین کو منتخب کیا اور کالج کے بعد گھر جانے کی بجائے سیدھا عدالت اپنے ابو کا ہاتھ بٹانے چلا آتا۔ پہلے پہل تو ابو نے مجھے بہت سمجھایا مگر میں نے یہ کہہ کر ان کو منا لیا۔

'ابو صرف اسی طرح ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کی اچھی پریکٹس ہو سکتی ہے اور کل کو اسی بنیاد پر سیشن کورٹ میں نوکری ملنے کا راستہ ہموار ہو سکے گا!'

ابو بڑی مشکل سے راضی ہوئے مگر اس کے بعد ان کے مشکل سفر میں میں نے باقاعدہ طور پر ان کی ہمراہی اختیار کر لی۔ اس کے بعد زندگی کی غیر ہموار ڈگر پر ہم دونوں اکٹھے چلنے لگے۔ جہاں بھی جاتے اکٹھے جاتے۔ آنے والے چند برسوں میں ایک دوسرے کی ہمسفری کی ایسی پختہ عادت بن گئی کہ کوئی سفر ان کے بغیر نہ شروع ہوتا اور اگر ہوتا تو کبھی آسانی کے ساتھ ختم نہ ہوتا۔ میں رحیم یار خان کی سڑکوں پر بائیسکل پر ان کے ساتھ کوئی بھی سفر شروع کرتا تو ان کے ہلکے پھلکے وجود کا بائیسکل کے کیریئر پر سوار ہونے کا مجھے کبھی اندازہ ہی نہ ہوتا تھا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے ان کا ایک ہاتھ ہمیشہ میرے دائیں کاندھے پر رہتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے سبز پروں والے کسی مہربان فرشتے کا مہربان سایہ میرے وجود پر پھیلا ہو۔ وہ مجھے امیدیں اور دعائیں بغیر حساب کے بانٹتے رہے اور میں ایک ایک کر کے ان کی تمام خواہشیں پوری کرتا گیا۔ میں نے دو مسلسل دنوں میں لیور برادرز اور سیشن کورٹ میں سٹینو گرافر کی نوکریاں ان گنت امید واروں کو مات دے کر میرٹ پر حاصل کیں تو اس سہ پہر زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے گلے سے لگے ان کے وجود کی لرزش کو صاف محسوس کیا۔ میں نے انہیں اتنے سانحوں اور کڑے امتحانوں سے گذرتے دیکھا تھا مگر اس سے پہلے میں نے ان کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے!

'مجھے تم پر فخر ہے!' وہ اس سہ پہر اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہہ پائے اور حسب عادت میرے کاندھے کو چوم کر اپنی دلی کیفیات کو چھپا گئے!

اپنی والدہ اور دادی کے بھرپور مخالفت کے باوجود ان کے مشورے پر میں نے لیور برادرز والی نوکری کو ٹھکرا کر سیشن کورٹ والی نوکری کو چنا۔ اگلے چند برسوں میں میری ایمانداری اور پرفارمنس کے چرچے ان کی کھانسی گھٹاتے اور بقول ان کے ان کی عمر بڑھاتے رہے۔ اگلے چند برسوں میں میں نے ان کی کئی اور دیرینہ دلی خواہشوں کو بھی پورا کر ڈالا۔ پرائیویٹ امتحان دے کر صرف ایم اے انگلش کا امتحان پاس ہی نہیں کیا بلکہ یونیورسٹی بھی ٹاپ کی۔ اس بنا پر میں نے ان دنوں لیکچرار شپ کی خواہش پال ڈالی تو میری نوکری کے لئے سب سے زیادہ دعائیں اور کوششیں انہوں نے ہی کیں۔ ملکی حالات ایسے

تھے کہ سرکاری کالجوں میں لیکچرار شپ پر صوبائی حکومتوں نے پابندی لگا رکھی تھی اور جب یونیورسٹی میں لسانی بنیادوں اور اقرا پروری کے باعث لیکچرار کی ایک اسامی پر میری تعیناتی نہیں ہوسکی تو ایک بار پھر مَیں مایوسی کے اندھے غار میں جا گرا۔ ایسے میں میرے ابو ہر بار میرے لئے ایک امید کی شمع روشن کرتے مگر میری مایوسی کی تیز ہَوا ان کی شمع گُل کر دیتی۔ وہ میری زندگی کا مشکل ترین سال تھا۔ مَیں سٹینو گرافی کرتے کرتے تھک گیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ میرے ابو اس عمر میں اتنی محنت کریں۔ ایسی مایوسی اور اتنی مشکل مالی صورتحال میں مجھے علم ہی نہیں ہوسکا کہ انہوں نے کیسے اپنی بڑی بیٹی اور میری چھوٹی بہن کی شادی کر ڈالی۔ مجھے اندرونی کہانی کا تب علم ہوا جب ایک برس بعد مجھے سعودی عرب میں ایک معمولی نوکری کی آفر ہوئی اور مَیں نے منہ بھر کر اس نوکری کو ٹھکرا تے ہوئے لیکچرار شپ کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔ ایسے میں انہوں نے اکیلے میں کھانستے ہوئے مجھ سے نظریں ملائے بغیر ایک ایسا تکلیف دہ اعتراف کیا جس نے سوچ کے ساتھ ساتھ میری زندگی کا دھارا بھی بدل ڈالا!

'تم پریشان تھے اس لئے تمہیں نہیں بتایا..... تمہاری بہن کی شادی کے لئے مجھے سُود پر قرض لینا پڑا...... ایک سال گذر گیا ہے اور اب مجھ سے اس کی ماہانہ قسط نہیں اتاری جاتی..... مجھے معاف کر دو بیٹے مگر مجھے لگتا ہے کہ تمہاری مدد کے بغیر اب مَیں یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا...... اگر مناسب سمجھو تو بیرونِ ملک چلے جاؤ...... میرا دل کہتا ہے اس میں برکات ہوں گی اور تمہارے لئے کشادہ اور حلال رزق کے نئے در کھلیں گے...... کیا تم اپنی لیکچرار شپ کی خواہش قربان کر کے اپنے ابو کی مدد کر سکتے ہو بیٹے؟'

میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا!

میرا عظیم بوڑھا باپ جس نے زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا، ساری زندگی مجھے امیدیں بانٹی تھیں، آج وہ سر جھکائے میرے سامنے بیٹھا پر امید نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میری مدد کا طلبگار تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سے مدد مانگی تھی اور یہ اعزاز میرے حصے آیا تھا!

مَیں نے اپنے باپ کے دونوں ہاتھ تھامے اور ایک لمحے میں اپنی تمام دلی خواہشیں اور ارادے ہَوا میں اڑا دیے۔ میرے پاس اپنے بوڑھے باپ کو دینے کے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا!

مگر سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس کے آگے سفر ان کے بغیر تھا!

ان کا مہربان ہاتھ میرے کاندھے سے ہٹنے والا تھا!

اور ان کا شفیق چہرہ میرے ساعتوں سے اوجھل ہونے والا تھا!

ریلوے سٹیشن پر جس روز مَیں نے انہیں اور اپنے باقی گھر والوں کو رخصت کیا وہ میری زندگی کا تکلیف دہ ترین لمحہ تھا۔ ٹرین چلی تو وہ میرا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ٹرین تیز ہوئی تو وہ تقریباً ساتھ ساتھ بھاگنے لگے۔ وہ بھی رو رہے تھے اور مَیں بھی رو رہا تھا!

اور پھر ساتھ کے ساتھ ساتھ ان کا ہاتھ بھی چھوٹ گیا!

وہ مہربان چہرہ دھیرے دھیرے میری نظروں سے دُور ہونے لگا اور پھر چند ساعتوں میں وہ چہرہ لوگوں کے ہجوم میں کہیں اوجھل ہو گیا!

بیرونِ ملک میں گذارے ابتدائی دو برس میرے لئے تختۂ دار پر پھانسی کے منتظر کسی قیدی کی مانند تھے۔ میری ہر ابتدائی مشکل اور مایوسیوں پر اگر وہ امیدوں کے معطر پھول مجھے باقاعدگی سے خط میں نہ بھیجتے تو شائد مَیں دوسرے مہینے ہی وہاں سے بھاگ آتا۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے لگنے لگا کہ میرے پاس نہ ہوتے ہوئے بھی وہ میرے ساتھ ہی تھے اور ان کا ہاتھ مجھے اپنے کاندھے پر رکھا ہوا صاف محسوس ہوتا۔ انہیں کے مشوروں، دعاؤں اور روشن کی ہوئی امیدوں کے طفیل مَیں نے دو برسوں میں نہ صرف ان کا سُود کا قرض بھی اتار ڈالا بلکہ ضد کر کے انہیں مزید کام کرنے سے روک دیا۔ میری شادی بھی ان کی خواہش کے مطابق اسی خاندان میں ہوئی اور اپنی شادی پر مَیں نے بہت حیرت کے ساتھ اپنے ابو کو لڈی ڈالتے ہوئے بھی دیکھا۔ اپنا مکان بھی نصیب ہوا، اپنی گاڑی کی اگلی سیٹ پر پہلی بار میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں نظر سے زیادہ خوشی کی چمک اور آنسو تھے۔ اس نئی قسم کی سواری پر وہ میرے ساتھ سوار تھے مگر بائیکل کی سواری کے طرح ان کا ہاتھ میرے کاندھے پر نہ ہوتے ہوئے بھی وہیں تھا!

سال اب تیزی کے ساتھ وقت کا ایندھن بننے لگے تھے۔اپنے ابو سے سالانہ ملاقات ہمیشہ تشنگی سے بھرپور تھی۔ہر بار فون پر ان سے کی گئی طویل گفتگو ہمیشہ ایک ادھورا سا احساس چھوڑ جاتی مگر ایک شے اب بھی جوں کی توں تھی!

وہ میری زندگی کا ایک ٹارگٹ پورا ہونے کے بعد مجھے ایک نیا چیلنج دے دیتے اور ہر بار میرا فوری ردعمل یہی ہوتا.....

'یہ تو ناممکن ہے ابو.....یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکے گا!'

'کیوں نہیں ہو سکتا.....یہ کام تو ہر صورت کرنا ہے بھئی.....بالکل اس طرح جیسے اس سے پہلے سب مشکل کام تم نے کر کے دکھائے!' وہ ہر بار اس سے ملتے جلتے سادہ لفظوں میں بے یقینی کی زمین پر چاروں شانے چت پڑے اپنے بیٹے کو اٹھانے کی کوششوں میں لگ جاتے اور تب تک ہمت نہ ہارتے جب تک وہ ناممکن کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچ جاتا!

جب ان کی اسی سالہ والدہ اور میری دادی جان نے میرے بازوؤں میں آخری سانس لی تب بھی ان کی خوش امیدی کا وہی عالم تھا!

'میں ابھی ڈاکٹر کو بلواتا ہوں.....مجھے یقین ہے ٹھیک ہو جائیں گی.....پہلے بھی انہیں اس طرح ہوا تھا.....ڈاکٹر صاحب کے انجکشن لگاتے ہی وہ نارمل ہو گئی تھیں!'

مجھے تقریباً چیخ کر انہیں سمجھانا پڑا کہ وہ وفات پا چکی ہیں اور اتنی خوش امیدی بھی اچھی نہیں!

جب وہ بیرون ملک اپنے بیٹے کے گھر آئے تو ان کی خوشی دیدنی تھی!

'یہ تو محل ہے!'

اور میں حیرت سے اپنے دو کمروں کے اپارٹمنٹ کو بے یقینی کے عالم میں نئے سرے سے دیکھنے لگا!

'یہ محل کہاں سے ہے ابو؟.....یہ تو صرف دو کمروں کا اپارٹمنٹ ہے!'

'تمہیں کیا پتہ میں اسے کس نظر سے دیکھتا ہوں.....میرے لئے یہ محل ہے جس میں میرا بیٹا بادشاہوں کی طرح، میری بہو ملکہ کی طرح اور میرا پوتا شہزادوں کی طرح رہتے ہیں!'

اور میں نے دل ہی دل میں اپنے ابو کی سادگی اور قناعت پسندی پر مسکرانے پر اکتفا کیا!

جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے بیٹے کی زندگی کے تمام ٹارگٹ پورے ہو گئے ہیں تو انہوں نے ساری توجہ اپنے علاقے کی مسجد کی طرف مرکوز کر لی۔ہر بار سالانہ چھٹی پر یا کسی فون کال کے دوران وہ چپکے سے میرے کان میں مسجد سے متعلقہ ایک نیا مشن ڈال دیتے۔

'کم بخت واپڈا والے عین جماعت کے دوران بجلی بند کر دیتے ہیں.....جمعے والے دن تو بہت مسئلہ ہوتا ہے.....مسجد کے لئے ایسا جنریٹر لینا ہے جس سے کم از کم آدھے پنکھے تو ضرور چل سکیں!'

'مسجد میں پینے والے ٹھنڈے پانی کا ایک کولر ہونا چاہیے!'

'مسجد کے کارپٹ پرانے ہو گئے ہیں.............انہیں بدلوانا ہے!'

'مسجد کے تحفیظ القرآن والے مدرسے میں رہنے والے اور قرآن حفظ کرنے والے یتیم بچوں کے لئے ماہانہ راشن ہونا چاہیے اور چونکہ بچے زیادہ ہیں چنانچہ ان کے لئے ہانڈی روٹی کرنے والی ایک ملازمہ کا بندوبست کرنا ہے!'

'مسجد کا لاؤڈ سپیکر نیا ہونا چاہیے.....دس سال سے ایک ہی سپیکر چلا جا رہا ہے.....اب چل چل کر بیچارا پھٹ چکا ہے!'

خاندان میں لڑکیوں، لڑکوں کے رشتے ہوں یا گھر کے سامنے ابتر حالت والی سڑک، وہ کسی نہ کسی مشن کی تحریک ڈال دیتے اور میرے ساتھ ساتھ بہت پر امید انداز میں دوسروں کو بھی 'اور بہتر' اور 'یہ تو کرنا ہی ہے!' کی ترغیب دیتے رہتے۔اور تو اور ملک کی بدترین سیاسی قیادت کے ایک معمولی سے اچھے قدم کو بھی بہت پر جوش انداز میں انقلابی قدم اور اسے ملک کی تقدیر اور برا وقت بدلنے کا اشارہ قرار دے دیا کرتے!

اپنے ابو کے ساتھ اس چوالیس سالہ ساتھ کے سفر کے بعد یہ راز کافی حد تک مجھ پر منکشف ہو چکا تھا کہ ان کا ہر مشن امید، دیانت، عملی کوششوں اور دعاؤں پر تعمیر ہوتا تھا اور اب تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ان چار اجزائے ترکیبی کی موجودگی میں میرے ابو کے کسی مشن کی ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ میں اپنے ابو کے کسی نئے مشن کے متعلق جان کر اب کبھی یہ نہیں کہتا تھا کہ یہ کام آخر ممکن کیسے ہوگا!

اور پھر ایک زرد دوپہر جب بیٹھے بٹھائے مجھے یہ اطلاع ملی کہ شدید کھانسی اور بے ترتیب

سانس کے باعث انہیں ہسپتال میں داخل کرنا پڑ گیا ہے تو مَیں اپنی سب مصروفیات چھوڑ چھاڑ کر پاکستان جا پہنچا۔ ان کی حالت کافی تشویش ناک تھی سوا پنے آپ کو ابو کا سچا وارث ثابت کرنے کے لئے زندگی میں پہلی بار مَیں نے ان میں امیدیں بانٹنے کی مشکل ذمہ داری سنبھالی۔

'آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے ابو..... ڈاکٹر صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ آپ کے سپٹم ٹسٹ کا رزلٹ پہلے سے بہت بہتر آیا ہے!'

'آج آپ کا سانس کل سے بہت بہتر ہے ..... نئے انہیلر کا معیار واقعی اچھا ہے..... بس جلدی سے مکمل ٹھیک ہو جائیں!'

'نیبولائزر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا ہے ..... میرا خیال ہے اب آپ کے سعودی عرب کے اگلے دورے کی پلاننگ شروع کر دینی چاہیے!'

اور میرے سادہ مزاج ابو ان امید افزا باتوں کو سن کر مسکرا اٹھتے!

'اب مَیں ٹھیک ہوں تم واپس جاؤ..... تم اپنی کمپنی کے مصروف افسر ہو..... ہر روز تمہارے دفتر والے تمہیں فون کر کے واپسی کا پوچھتے ہیں..... مجھے کچھ نہیں ہوگا..... انشا اللہ ٹھیک ہو کر مَیں اور تمہاری امی جلد سعودی عرب آئیں گے اور چھ مہینے تک تمہارے پاس رہیں گے!'

مَیں با دلِ نخواستہ سامان باندھ کر واپسی کے سفر پر نکلا تو وہ اب بھی مجھے فراخ دلی کے ساتھ امیدیں بانٹ رہے تھے۔ ان کا پاس امیدوں کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ جتنا بانٹتے اور خرچ کرتے تھے، اُتنا ہی بڑھتا چلا جاتا تھا۔ مَیں جانے سے پہلے ان کے گلے سے لگا تو ان کا ناتواں وجود فرطِ جذبات سے لرزنے لگا۔ انہیں اس طرح جذباتی ہوتے دیکھ کر مَیں نے واپسی کا ارادہ بدلنا چاہا۔

'نہیں بیٹے..... تم جاؤ..... پھر ملیں گے انشا اللہ..... تمہارے ساتھ کی پرانی عادت ہے ناں..... تم سے بچھڑتے ہوئے ہمیشہ اسی طرح دل خراب ہوتا ہے..... بے فکر ہو کر جاؤ..... اللہ کی امان..... گھبرانا نہیں بیٹے..... مَیں تمہارے ساتھ ہوں!'

یہ کہتے ہوئے انہوں نے پہلے میرے کاندھے پر اپنا لرزتا ہاتھ رکھا اور پھر حسبِ عادت گلے ملتے ہوئے میرے کاندھے کو چوما!

اس سہ پہر مجھے ان کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے کسی بچے کے ہاتھ سے اس کا وہ رنگین غبارہ چھوٹ گیا ہو جسے اس نے بہت ضد کے بعد بڑے شوق سے پایا تھا اور وہ روتے ہوئے اپنے رنگین غبارے کو آسمان کی طرف بلند ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہو!

وہ زندگی میں ہماری آخری ملاقات تھی!

ابھی سفر کی تھکن بھی نہ اُتری تھی کہ اگلی صبح فون پر اطلاع مل گئی کہ ابو آخری سفر پر اکیلے روانہ ہو گئے!

مجھے بتایا گیا کہ میرے جانے کے بعد اسی رات ان کی حالت اچانک پھر بگڑ گئی تھی۔ شائد میری بانٹی ہوئی امیدیں جھوٹی تھیں یا پھر اتنی کم اثر کہ وہ ایک رات بھی ان کے ساتھ نہیں چل سکیں!

ہسپتال میں آخری سانسیں لیتے ہوئے جب ان کے لئے سانس لینا بھی محال ہو رہا تھا تو نرس نے ان سے پوچھا تھا۔

'ہمت کر کے یہ چند گولیاں کھا سکیں گے؟'

اور میرے ابو تھے کہ ایسی حالت میں بھی ان کی خوش امیدی کا وہی عالم تھا!

'ہاں ہاں کیوں نہیں..... کھا لوں گا مَیں!'

انتہائی نحیف آواز میں انہوں نے سر ہلا کر بڑی امید کے ساتھ یوں اپنی زندگی کی آخری خوراک کھائی تھی جیسے انہیں یقین تھا کہ اس دوا کے کھاتے ہی وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے!

آخری سفر پر ان کا ساتھ دینے کے لئے فون پر میری آمد کے بابت پوچھا گیا تو مَیں نے شرعی تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ان کی تدفین کی اجازت دے دی کیونکہ بیرونِ سفر سے آتے اور اپنے چھوٹے شہر میں پہنچتے تک بہت دیر ہو جاتی۔ وہ میری زندگی کا تکلیف دہ ترین سفر تھا۔ سارا راستہ لوگوں سے اپنا دکھ چھپانا پڑا اور تمام آنسوؤں کو بڑی محنت کے ساتھ سنبھالے رکھا۔ علی الصبح جب اپنے شہر پہنچتے ہی مجھے ان کی تازہ قبر تک پہنچایا گیا تو ان کی قبر کی مٹی مجھ سے گلے کرنے لگی۔ مَیں نے اپنے تمام آنسو ان کی قبر پر بچھا ڈالے اور جب اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ان کی قبر کی گیلی مٹی پر رکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ابو نے میرے دائیں کاندھے پر ہاتھ رکھ کر میرے کانوں میں کہا۔

'گھبرانا نہیں بیٹے..... مَیں تمہارے ساتھ ہوں!!!'

# بندر کی انتخابی مہم

پشتون احمد زئی/وزیرستان

گلیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا میں سڑک نکل آیا سڑک سے ہوتے ہوئے جیسے ہی میں بازار کی طرف مڑنے والے چوک پر پہنچا تو کچھ ایسا دیکھا کہ آنکھیں مل مل کر دوبارہ دیکھنے پر مجبور ہو گیا لیکن پھر بھی نگاہیں تھیں کہ پہلی نظر کی طرفدار تھیں۔ ادھر اُدھر یقین کرنے کو نظر دوڑائی کہ واقعی آنکھیں کام کر رہی ہیں یا نہیں جب یقین ہوا کہ ہاں واقعی نظر میں تو کوئی فتور نہیں تو ایک دفعہ پھر چوک میں لگے اشتہاری تختے پر نگاہیں جما دیں لیکن پھر وہی دیکھا بھالا نتیجہ۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ انتخابات میں دن کم پڑتے جا رہے ہیں لیکن مجھے حیرت میں جس چیز نے مبتلا کر دیا تھا اور جس کی وجہ سے میں چوک پر گوتم بدھ کا مجسمہ بن کر رہ گیا تھا وہ حیرت انگیز چیز سامنے چوک پر لگی اشتہاری تختی تھی تختی پر لگے اشتہار میں بندر نے نیشنل اسمبلی کیلئے انتخابات لڑنے کا اعلان کر رہا تھا بندر کی نہایت خوبصورت تصویر سے سجے بورڈ پر جس میں بندر مکا لہرا کر اپنی طاقت کا اعلان کر رہا تھا یہ کچھ درج تھا ''نڈر اور بے باک مسٹر جونی، امیدوار برائے نیشنل اسمبلی۔ آپ کی بے لوث خدمت کا خواہاں، نئی نسل کی امید، بزرگوں کی امیدوں کا چراغ، آپ کا ووٹ، آپ کی بقا۔'' ساتھ ہی نظر پاس لگی تین تختیوں پر جا پڑی جن پر بالترتیب کھوتے، کتے جبکہ آخری اکلوتے اشتہاری بورڈ پر ایک غضب ناک حضرت انسان کا اشتہار تھا۔ جس پر وہی پانچ ساڑھے پانچ سال پہلے ہوئے انتخابات کے نعرے درج تھے۔ وہی وعدے جو باوجود منتخب ہونے کے ایفا نہ ہوئے بس اشتہار میں اگر کچھ تبدیلی تھی تو وہ تصویر کی تھی تین ساڑھے تین سال پہلے کی تصویر میں موصوف لیڈر شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے تھا اور پیٹ پیٹھ کو چھپائے دیتے دکھائی دیتا تھا لیکن اب کے جو تصویر تھی اُس میں وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس جبکہ پیٹ کمر کے مخالف سمت یوں سرپٹ نکل رہا تھا جیسے محبوب بعد صحبت یار کے بستر سے۔ قریباً میں پندرہ منٹ وہاں حیرت کی تصویر بنے کھڑا رہا مجھے کچھ جنگ سی محسوس ہو رہی تھی کچھ سوالات اُبھر رہے تھے عجب کشمکش میں تھا لیکن پتہ نہیں کیوں چوتھے اشتہار (یعنی حضرت انسان والے) پر نظریں پڑتے ہی سر یوں اوپر نیچے کو جھولنے لگا جیسے بچپن میں بزرگوں کی گالیوں پر جھول جایا کرتا تھا۔

میں اسی اگر مگر میں آگے بڑھا سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا کہ فٹ پاتھ پر تو فٹ پاتھیوں کا راج تھا کہ اچانک میرے قریب سے تین چار گاڑیوں میں بندر کا جلوس نکلا اور اگلے ہی لمحے میری نظریں مسٹر جونی پر تھیں۔ جونی گاڑی میں کھڑا لوگوں کی عقیدت کا جواب دے رہا تھا اُسکے سارے ساتھی کافی پُر جوش لگ رہے تھے مجھے یکا یک جیسے جھٹکا سا لگا بندروں نے ہاتھوں میں سرخ پرچم اُٹھا رکھے تھے پر ان میں ڈنڈے نہیں تھے لیکن مجھے اس کا جواب ایک بینر پر لکھا ہوا ملا '' پرچم اُٹھانے کو ہاتھ چاہیے کسی شاخ کی زندگی کا خاتمہ نہیں''۔ جلوس تو گزر گیا پر نجانے کیوں میرے دل میں جونی صاحب کی محبت میں کچھ پل بتانے کی آرزو جگا گیا۔ اور دوسرے گھنٹے میں بازار کے ایک معروف ہال میں موجود تھا۔ جہاں پر کچھ ہی لمحوں میں جونی صاحب تقریر کرنے والے تھے۔ یہ ایک پُر وقار تقریب تھی نظامت کے فرائض انتہائی خوبصورتی سے انجام پائے تھے یہاں پر نسل، رنگ، جن و انس، اور انسان و حیوان میں کوئی امتیاز نہ تھا سب برابر تھے خلاف معمول سٹیج زمین پر ہی تھا۔ اور یہ سوال بھی ذہن کے پردے پر اٹھکیلیاں کرنے لگا۔ مجھے بھی ایک کرسی نصیب ہوئی بیٹھا تو ہال تالیوں سیٹیوں اور نعروں سے گونج اُٹھا۔ سب لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو جونی صاحب بانکپن سے ننگے چلتے ہوئے سٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آتے ہی اُس نے رب کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر پہلا جملہ بولا، '' میں اُس بات پر یقین رکھتا ہوں جس پر تم لوگ نہیں رکھتے اور وہ عمل ہے میں لمبی چوڑی تقریروں سے آپ کا اور اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا میں عمل پسند ہوں اور عمل پر یقین رکھتا ہوں''۔ جو بھی بات کی خدا کی قسم لا جواب کی۔ ہم واقعی تبدیلی کے نعرے لگاتے ہیں انقلاب کی باتیں کرتے ہیں سرخ تحریکوں کی آڑ لیتے ہیں

لیکن کچھ نہیں کر پاتے۔ہم الیکشن سے پہلے انقلاب کی باتیں کرتے ہیں لیکن ہر بار وقت آنے پر ہمارے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں وہ نعرے وہ باتیں وہ پیماں سب عہد رفتہ کی داستانیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور ہم پھر سے پانی کے دھارے کے ساتھ بہنے لگ جاتے ہیں پھر سے ہماری وہی منزل وہی راہبر اور وہی راہزن ہوتے ہیں۔ ہمارے ہی بارے میں تو کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ" ہمارے لیڈر حامی نہیں اندھے اور گونگے بہرے مقلدوں کی افواج رکھتے ہیں"۔

جونی صاحب کی تقریر جاری تھی" میں آپ کے درمیان میں سے منتخب ہونا چاہتا ہوں مجھے آپ سے اونچی جگہ پر کھڑے ہونے میں شرم محسوس ہوتی ہے اس لئے میں آپ کے درمیان کھڑا ہوں اس لئے میں نے سٹیج زمین پر ہی لگوایا ہے۔مجھ سے آپ انسانوں کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی اس لئے انتخاب لڑنے کھڑا ہوا ہوں آپ انسانوں نے اس معاشرے میں مردوں کو آزمایا لیکن وہ کھوٹے سکے نکلے۔آپ نے عورتوں سے لو لگائی اور انھیں وزارتیں دیں لیکن ہمیشہ کی طرح وہ دغا دے گئیں اور پھر ہجڑے کھڑے ہو گئے وہ آپ کے آنسو پونچھنا چاہتے تھے لیکن آپ نے انھیں موقع نہیں دیا ہجڑوں کے بعد تو زیادہ حق ہماری برادری کا بنتا ہے۔آپ ہمیں آزما کے دیکھیں ہم امیدوں پر پورا نہ اتریں تو بے شک پھانسی چڑھا دینا" باتوں میں دم تھا وہ بہکا رہا تھا اور میں بہک رہا تھا وہ گمراہ کر رہا تھا اور میں گمراہ ہو رہا تھا پھر اس نے ٹانگ اٹھا کر اپنی ننگی پنڈلیاں دکھاتے ہوئے گونج دار آواز میں کہا" ارے خدا قسم کچھ نہیں ہمیں آپ سے کچھ نہیں چاہیے under wear تک نہیں ہمارا تو under wear تک کا بھی خرچہ نہ ہوگا نجانے کیوں اس بات پر ہنسنے کی بجائے میرے گالوں پر سے دو آنسو لڑھکتے ہوئے گریبان میں جذب ہو گئے اس کی باتوں سے غضب کا خلوص ٹپک رہا تھا۔واقعی بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے وہ بول رہا تھا" ہمیں صدر،وزیر اعظم اور وزراء کے لئے گھر بھی نہیں چاہیئے بلکہ جو ہیں اُن کو بھی یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں میں بدل دیں گے"۔اور میں نے قریب ہی بیٹھے دو جوانوں کو سرگوشی کرتے سنا" یار ایک ووٹ کے بدلے سودا مہنگا تو نہیں" دوسرا کہنے لگا" یار کم از کم یہ حکمران طبقے کی طرح ہمارے روپے پیسوں سے بیرون ملک جائدادیں تو نہیں خریدیں گے"۔اور آخر میں وہ کچھ ایسے توبہ شکن الفاظ ادا کر گیا جن کو ادا کرنے کی ہمت ہمارے نام نہاد سیاست دانوں میں بھی نہیں" میں نہ سندھی ہوں نہ بلوچی ہوں نہ پٹھان نہ پنجابی۔مجھے درد ایک سا محسوس ہوگا چاہے میرا بچہ گولیوں کا نشانہ بنے یا وزیرستان کا کوئی معصوم ڈرون طیارے کا شکار ہو جاوے، میرے آنسو ایک ہی طرح سے بہیں گے چاہے میرا بھائی اغوا ہو یا کوئی بلوچ جوان لاپتہ،کراچی کے حالات پر وہاں کے قتل و غارت پر میرے دل پر ایسی ہی چھریاں چل رہی ہوں گی جیسے میرے اپنے بچے بچیاں قتل ہو رہی ہوں سب سدھر جائے گا سب سدھر جائے گا بس آپ سدھر جانے کا ارادہ کر لیں تو"۔ہال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا اور میں نے دل میں ہی جونی صاحب کو لیڈر تسلیم کر لیا تھا۔آج بڑے دنوں بعد دل سے نکلی آواز سنی تھی آج لالچ سے پاک کوئی کلام سماعت سے گزرا تھا اور مجھے ثواب کا گماں ہو رہا تھا" میں سڑکیں بنواؤں گا،کالج بنواؤں گا بجلی کی لوڈ شیڈنگ ختم کرا دوں گا"۔میری آنکھ کھل گئی ایک منحوس شکل کا لیڈر راگ آلاپ رہا تھا بجلی آنے کی وجہ سے TV خود بخود چل گیا تھا کیونکہ رات کو میں بجلی کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا میں نے ریموٹ کا سرخ بٹن دبا دیا اور وہ بے سری آواز دم توڑ گئی پر کاش واقعی ایسا ہوتا،میری آنکھوں میں وہی خواب تھا اور دل میں اُمنگ کہ کاش وہ خواب خواب نہ ہوتا اور یزداں بھی میری اس معصومیت پر شاید مسکرا رہا تھا۔۔۔

### چور کا شکوہ

کن لوگوں سے پڑا ہے پالا<br>
ٹنڈ بھی کر دی منہ بھی کالا<br>
اتنی بڑی تو بات نہیں تھی<br>
بس ہوا ہی تھا اِک نالا

نازاو کاڑوی

### واپڈا والو

بجلی کھلے آنکھ کھولی<br>
تنگ آ کر پھر ماں یہ بولی<br>
تہاڈے گھر وی بھرا ہووے<br>
اُٹھنے والی جب ہو ڈولی

نازاو کاڑوی

# ”برزخ“

حجاب عباسی/کراچی

اس کے چہرے پر موت کی سی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ پوری جان سے کانپتے ہوئے اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ آپ مجھے اپنے ہاتھ سے ماردیں سائیں..... میں آپ پر قربان ہو جاؤں..... کہیں تو ابھی آپ کے سامنے چھری سے اپنا دل نکال کے آپ کے قدموں میں ڈال دوں..... پر سائیں یہ ..... یہ سب..... اس کی آواز رندھ گئی۔ پنھل..... تو جئے یا مرے..... ہم نے جو تجھ سے کہہ دیا وہ تجھے ہر صورت کرنا ہے۔ کیا تو نمک حرام ہے؟..... نہیں' نہیں سائیں..... میں بھی اپنے پرکھوں کی طرح آپ کا نمک خوار ہوں..... سائیں میرے پرکھوں نے آپ کے پرکھوں کے پسینے کی جگہ خون بہایا۔ میں بھی ان کی طرح..... میر شہباز نے ہاتھ اُٹھا کر اسے بولنے سے روکتے ہوئے کہا..... پنھل تیرے بڑے نمک حلال تھے..... مگر تو ان کے نام کو بٹا لگانا چاہتا ہے۔ ہم نے تجھے کبھی اپنا کمی نہیں سمجھا..... اپنے بڑوں سے ضد کر کے..... ان کی مرضی کے بغیر تجھے میٹرک تک پڑھایا۔ یہاں تک کہ بڑوں سے چھپ کر تجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا ہے پنھل..... ایک دوست کی طرح..... سائیں..... میں آپ پر قربان میں اور میری اگلی نسلیں آپ پر صدقے..... میر شہباز نے آنکھیں نکال کر کہا..... باتیں نہ بنا پنھل..... یہ باتیں تجھے ہم نے سکھائی ہیں..... تجھے تعلیم دلا کر..... ہمارے ساتھ رہ کر تو نے لفظوں کے موتی رولنا سیکھا ہے..... ہاں سائیں..... میں جو بھی ہوں..... آپ کی مہربانی سے..... آپ کے زیرِ احسان ہوں..... تو پھر جا..... جو ہم نے کہا ہے آج رات وہ کام پورا کر لے..... میر شہباز نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر اوپر کی طرف موڑتے ہوئے کہا..... پنھل کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ جوں کے توں باندھے ہوئے اسے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا دشوار لگ رہا تھا۔ ابھی کٹے درخت کی طرح زمیں بوس ہو جائے گا۔ بمشکل آنسوؤں کے گولے حلق سے اُتارتے ہوئے بولا..... مگر سائیں..... وہ تو ابھی صرف بارہ سال کی ہے..... اسے ابھی ان باتوں کا کچھ پتا نہیں..... وہ اپنی گڑیوں سے ایسے باتیں کرتی ہے جیسے اپنی سکھیوں سے بول رہی ہو..... سائیں اس کے چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت ہے..... اس کی کھنکتی ہنسی میرے ویران گھر میں زندگی اور روشنی کی علامت ہے..... سائیں..... اسے تو ابھی اپنی چنری سنبھال کر اوڑھنی بھی نہیں آتی۔ اس میں میری جان ہے۔ میرا اور ہے کون..... ؟ آپ جانتے ہیں سائیں' بابا اور ماں جی کے بعد میں اس کے سہارے زندہ ہوں..... سائیں..... ایک بار..... ایک بار آپ اسے دیکھ لیں اس کی معصومیت پر آپ کو خود رحم آ جائے گا..... سائیں..... ایک بار..... صرف ایک بار دیکھ لیں..... میر شہباز کا چہرہ قہر آلود ہو گیا۔ اس کی آواز پر سانپ کی پھنکار کا گمان ہو رہا تھا۔ بس..... ایک لفظ نہیں سننا چاہتا..... تو جانتا ہے مجھے زینو ایسے ہی عزیز ہے جیسے تجھے شہزادی..... پنھل نے میر شہباز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا..... پھر بھی.....؟ سائیں پھر بھی آپ یہ چاہتے ہیں.....؟ اس لئے کہ ہم..... ہم زینو کو..... ہم اسے اپنے سے جدا نہیں کر سکتے..... میر شہباز نے پنھل سے نظریں چراتے ہوئے کہا..... پنھل نے کہا..... سائیں..... آپ جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ میر شہباز نے کرسی سے اُٹھ کر پنھل کی طرف پیٹھ کر دی اور بولے۔ ہم نے تجھ سے غلط اور صحیح نہیں پوچھا۔ تو اتنی لمبی باتیں کیوں کر رہا ہے.....؟ تجھے یہ کام کرنا ہی کرنا ہے۔ اور اب جب تجھے سارا راز معلوم ہو گیا۔ یہ راز..... سائیں..... یہ راز کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا..... مجھے بے موت نہ مارو سائیں..... میں نے شہزادی بہن کے لئے بڑے سہانے خواب دیکھے ہیں..... وہ میر شہباز کے قدموں میں گر پڑا۔ میر شہباز نے اسے ایک پیر سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ تو نے ہم سے پوچھ کے خواب دیکھے تھے.....؟ اور پھر تُو نے سنا نہیں.....؟ خواب کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔ پنھل کے پھوٹ پھوٹ کر رونے پر اسے کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ پنھل نے کہا۔ سائیں آپ نے مجھے بڑی عزت دی ہے۔ آپ نے نالی کے کیڑے کو..... میر شہباز نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا..... پنھل..... تیری عزت میں اضافہ ہو گا..... لوگ تیری عزت پر..... تجھ پر فخر کریں گے..... میں تجھے زیادہ سزا نہیں ہونے دوں

گا..... اچھے سے اچھا وکیل تیرا کیس لڑے گا..... میں ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھوں گا پنھل میرا سینہ ویران کرکے.....؟؟ سائیں..... لوگ دُنیا میں نیک کام اس لئے بھی کرتے ہیں کہ ان کے بعد ان کا نام عزت سے لیا جائے..... جب تک گوٹھ کا ایک بچہ بھی زندہ ہے ہمارا نام بے عزتی سے لیا جائے گا..... پنھل نے یہ بڑے بڑے آنسو آنکھوں میں بھرتے ہوئے کہا..... سائیں..... میں اپنے آپ کو گولی ماروں گا..... تو کیا اس طرح تیری شہزادی جی پائے گی.....؟؟ نہیں پنھل نہیں..... لوگ وہی بات جائیں گے جو ہم نے تجھ سے کہی ہے۔ ہاں بس..... یہ ہوگا کہ ہمیں ایک اور وفادار کا امتحان لینا پڑے گا۔ میر شہباز نے پنھل کی طرف پیٹھ کئے سامنے کارنس پر رکھی زینو کی تصویر پر نظریں گاڑ دیں..... کتنی معصومیت..... کتنی ملاحت ہے میری زینو کے چہرے پر..... وحشی ہرنی جیسی آنکھیں..... ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ..... کیا میں اس سب کو کھو سکتا ہوں.....؟؟ اسے لگا اس سوال کے جواب میں اس کا وجود خالی خالی ہو گیا ہے..... ایسا ہو جائے تو.....؟؟ نہیں..... نہیں..... ایسا نہیں ہونا چاہئے..... میرے وجود کے کشکول میں قدرت نے ایک ہی تو سکہ ڈالا ہے..... اس نے پھر پیار بھری نظروں سے زینو کی تصویر کو دیکھا۔ اس نے شہر سے آتے ہوئے ڈیجیٹل کیمرہ خریدا تھا۔ اور پہلی تصویر زینو کی اتاری تھی۔ وہ پہلی اور واحد تصویر تھی زینو کی..... غور سے دیکھتے دیکھتے تصویر دھندلانے لگی تو گھبرا کر میر شہباز پلٹ گیا..... پنھل دھاروں دھار رو رہا تھا۔ میر شہباز کے دل کے کسی گوشے میں رحم اور افسوس کی ہلکی سی لہر اُٹھی مگر اس نے فوراً اس لہر کو دبا دیا۔ ایک لمحہ خاموشی سے پنھل دیکھتا رہا۔ آنکھوں میں استقلال اور چہرے پر فیصلہ کن تاثر کے ساتھ..... پھر دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا..... پنھل جا..... صبح میں خبر کا انتظار کروں گا..... سر جھکائے نہیں سر اُٹھا کے آنا ..... اور پھر کچھ اور کہے بغیر..... کچھ سنے بغیر..... پنھل کو دیکھے بغیر اپنے اسٹڈی روم سے نکل کر حویلی میں اندر کی طرف چلا گیا۔ اس کے اسٹڈی روم میں پنھل اور حویلی کے رکھوالے چاچا عبداللہ کے سوا کوئی نہیں آ سکتا تھا۔

چاہتے ہوئے بھی میر شہباز ساری رات نہ سو سکا۔ وہ تو چاہتا تھا اتنی غافل نیند سوئے کہ اس کا ضمیر اس کے کانوں میں کوئی سرگوشی کرے بھی تو وہ نہ سن سکے۔ کبھی چت لیٹ کر چھت کو تکنے لگتا تو چھت سینما اسکرین بن جاتی اور اس پر جو مناظر نظر آتے وہ اس کے بدن میں آگ لگا دیتے۔ اسے لگتا کنپٹیاں خون کے دوران کی تاب نہ لا کر پھٹ جائیں گی..... اُٹھ کر پورا جگ پانی پی جاتا۔ جگ سے ہی منہ لگا کے..... ادب آداب کے سارے تقاضے بھول کے..... پھر کمرے میں اتنا ٹہلتا کہ اگر کسی سیدھے راستے پر چلتا تو کئی کوس کا سفر طے کر چکا ہوتا۔ رات اتنی طویل ہوتی ہے۔ یہ اسے آج معلوم ہوا..... کچھ مناظر آج اس کے ذہن میں واضح ہوئے تھے۔ عید سے دو روز پہلے زینو کا منہ بسورنا کہ اس کے نیلے سوٹ کی میچنگ کی چوڑیاں نہیں آئیں۔ بی بی جی (ماں) زندہ ہوتی تھیں تو ہر سوٹ کے ساتھ پراندہ اور چوڑیاں لاتی تھیں..... بابا تو زینو کے لئے پائل لا کر اس کے پیروں چلنے کی حسرت لئے منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ اب میر شہباز شہر سے ہاسٹل میں رہنے والے یونیورسٹی کے دوستوں کی آمد کی وجہ سے اسے بازار نہیں لے جا سکتا تھا۔ دوست اس کے ساتھ بڑی عید منانے آئے تھے' وہ انہیں نہ چھوڑ کر جا سکتا تھا نہ لے کر..... پھر زینو کی سہیلی شانی نے جو حویلی کے رکھوالے چاچا عبداللہ کی بیٹی تھی اس نے کہا..... ادا..... یہ مراد کس مرض کی دوا ہے.....؟ صرف گاڑیوں کی دیکھ ریکھ اور ڈرائیوری کرتا ہے' کھاتا اتنا ہے..... اسے بھیجو نا..... ہڈحرام کو..... میر شہباز نے چند لمحے سوچا..... مراد سیدھا سادا..... فرض شناس نوجوان ہے..... ذمہ داری سے لے جائے گا..... اس نے زینو اور شانی کو ہدایات دیں ..... وہی ہدایت مراد کو بھی دیں کہ لڑکیاں گاڑی سے نہ اُتریں..... مراد دکان سے چوڑیوں کے ڈبے لائے اور وہ لوگ پسند کرلیں..... مراد نے ساری ہدایات سعادت مندی سے سر جھکا کے سنیں..... جی سائیں..... جی سائیں کرتا رہا..... اب میر شہباز خوش تھا کہ اس کی چہیتی بہن اپنی پسند کی چوڑیاں لے لے گی..... زینو کے آنسو اس کے دل پر گرتے تھے..... اب زینو نہیں روئے گی..... دوستوں میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اسے احساس ہوا کہ زینو اور شانی کو کچھ زیادہ ہی دیر لگ گئی ہے..... واپس آنے پر پوچھا تو شانی بولی..... ادا یہ تمہاری بہن بڑی نخریلی ہے..... اسے کوئی چیز پسند ہی نہیں آرہی تھی..... دیر تو ہوئی تھی..... اس نے زینو کی طرف دیکھا..... اس کے چہرے پر گلاب کھلے ہوئے تھے..... آنکھوں میں ستارے سے جگمگا رہے

تھے...... ایک لمحے کو اس کے دل کو کچھ ہوا...... پھر وہ مطمئن ہو گیا کہ شاید اپنی مرضی کی چیزیں خرید کر زینو بہت خوش ہے...... لیکن جلد ہی شہر میں تعلیم حاصل کئے میر شہباز پر اس کے وجدان نے آگہی کے در وا کر دیئے...... اور وہ پوری جان سے سلگ اُٹھا...... کئی کئی راتیں جاگتے اور دن کمرے میں بند رہتے گزارے...... سوچیں اس کے ذہن پر کوڑوں کی طرح برستیں...... وہ اپنے دل...... اپنی محبت کے آگے مجبور ہو کر دھاروں دھار رو پڑتا...... وہ سوچتا...... کیا وہ بے غیرت ہے......؟ نہیں...... نہیں...... یہ بے غیرتی نہیں...... یہ میری مجبور محبت ہے...... پھر سوچ سوچ کر اس نے آخر کار حل نکال لیا...... محبت کو بچانے کا...... غیرت کے ہاتھوں انتقام لینے کا...... اور آج پنھل کو پل صراط پر کھڑا کر دیا تھا...... وہ بار بار کھڑکی سے آسمان کو دیکھتا...... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے آسمان کے کناروں کو تکتا کہ کہیں سے...... کسی اور سے صبح کی کرن سر اُٹھا رہی ہے یا نہیں......؟ مگر ایک گہرا اندھیرا ہر طرف راج کر رہا تھا...... اُف...... کب صبح ہو گی...... کب اسے وہ سب معلوم ہو گا...... کب...... کب پھر آخر کار صبح ہو گئی...... وہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا...... مگر کس کا......؟ یہ اسے بھی پتا نہ تھا...... وہ صحن میں ٹہلتا رہا...... پھر ورانڈے میں پڑے جھولا نما صوفے پر بیٹھ کر کل کا اخبار پڑھنے لگا...... اتنے سویرے آج کا اخبار کہاں آتا......؟ کیا پڑھ رہا تھا......؟ یہ اسے بھی خبر نہ تھی...... بس ایک انتظار تھا...... بے چینی تھی...... دل بے طرح دھڑک رہا تھا...... دل کا کوئی نرم گوشہ اسے ملامت کرنے لگتا تو وہ سر جھٹک کر واقعی کچھ پڑھنے لگتا۔ اچانک گھمو تیز تیز قدم اُٹھاتا اسے اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس نے بے نیازی دکھانے کو...... یا شاید چہرے پر بے چینی کے تاثرات چھپانے کو اخبار منہ کے آگے کر لیا...... گھمو نے قریب آ کر پھولی ہوئی سانس اور گھبراتی آواز میں کہا...... سائیں...... پھر اس کی آواز بھرا گئی...... میر شہباز نے لاپرواہی سے پوچھا...... کیا ہے......؟ کیا سائیں سائیں کی رٹ لگائی ہوئی ہے...... کچھ بول تو...... گھمو روتے ہوئے بولا...... سائیں...... پنھل نے...... پنھل نے...... میر شہباز نے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے پوچھا...... کیا پنھل نے......؟ آگے بول نا...... گھمو بولا...... پنھل نے شہزادی اور مراد کو گولی مار کر خود کو بھی مار لیا...... میر شہباز نے نہ چاہتے ہوئے بھی اطمینان کا لمبا سانس لیا...... پھر لاپرواہی سے بولا...... ہاں بابا...... غیرت مند جوان تھا...... ہمیں تو پتا تھا کسی دن شہزادی کو کاری کرے گا...... یہ انجام تو ہونا تھا نا......

شہزادی اور مراد کو سوچنا چاہیے تھے...... گھمو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ سائیں...... اب......؟ ارے بابا...... اب کیا...... پولیس کو اطلاع کی......؟ گھمو بولا نہیں سائیں...... تو جاؤ پولیس کو اطلاع کرو...... ہم بھی ابھی شریکوں کے ساتھ آتے ہیں...... میر شہباز نے کہا...... گھمو ہچکچاتے ہوئے بولا...... سائیں...... کل ملا کر بارہ بندوں نے لاشیں دیکھی ہیں...... ان میں...... وہ آپ کے دشمن شریک بھی ہیں...... تو......؟؟ میر شہباز نے گھمو کو گھورا...... سارا گاؤں دیکھے گا بابا......

گھمو آہستہ اور لرزتی آواز میں بولا...... وہ...... وہ...... سائیں...... اب کیا وہ وہ لگا رکھی ہے......؟ جا...... ان دوسروں نے پولیس بلا بھی لی ہو شاید...... ہم بھی ابھی آتے ہیں...... گھمو نے ہاتھ جوڑ کر میرے شہباز کے ذرا قریب آ کر ہلکی اور لرزتی آواز میں کہا...... سائیں...... مراد کی...... مراد کی جیب سے بی بی زینو کی تصویر نکلی ہے......

میر شہباز کو لگا اس کے دل میں دھماکا ہوا ہے...... آنکھیں پھٹ گئیں...... گھمو پر جمی رہ گئیں...... پھر ننگے پاؤں اسٹڈی کی طرف بھاگا...... اندر جا کر دیکھا...... اور کٹے درخت کی طرح زمین پر گرا...... کارنس پر زینو کی تصویر نہیں تھی......

## ادب سرائے ساہیوال کا سالانہ نعتیہ مشاعرہ

ادب سرائے ساہیوال کا ۲۶۳ واں مشاعرہ زیر صدارت جناب نصیر احمد منعقد ہوا جس میں حضور ﷺ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا۔ سید ریاض منیر زیدی مہمانِ خصوصی تھے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر ندیم عباس اشرف نے انجام دیے۔ مشہور نعت خواں و نعت گو جناب علی رضا کی نہایت خوش آہنگ نعت خوانی سے نعتیہ مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جس میں نصیر احمد، سید ریاض حسین زیدی، علی رضا، واصف سجاد، اوصاف شیخ، سید صفی شاہ، ندیم عباس اشرف اور دیگر مقامی نعت گو حضرات نے اپنا کلام نعت پیش کیا۔ نصیر احمد کے نئے نعتیہ مجموعہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ اجلاس میں نامور ناول نگار عبداللہ حسین کے انتقال پر گہرے رنج و الم کا اظہار کیا گیا۔ جناب سید ریاض حسین زیدی نے اپنے خطاب میں نعتیہ کلام کی پختگی کو سراہا اور دعا کی کہ رب العزت نعت کی حلاوتیں ہمارے قلوب میں اتارے۔

# ہم نفس

صدف زبیری/مسقط

آج سے ایک کم چالیس برس پہلے جب میں اُس کے سنگ رخصت ہو کر اس گھر میں آئی تھی تو وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا اور پھر اگلے اٹھارہ برس وہ میرے لئے اجنبی ہی رہا۔ ہماری زندگی کا آغاز بالکل بھی عام لوگوں جیسا نہیں تھا۔ نہ شادی کے اوّلین دنوں والی شوخیاں، نہ محبت بھری سرگوشیاں، نہ روٹھنا نہ منانا، ضرورت تک محدود یہ تعلق بہت عجیب سا تھا۔ اسکے پتھریلے پہاڑ جیسے دل کو کھولنے والے کھل جا سم سم کے منتر کو میں کبھی جان ہی نہ پائی۔ شہر کی مضافاتی بستی کی جن تنگ گلیوں سے میں رخصت ہو کر آئی تھی انہی جیسی دوسری گلیوں میں آ بسی۔ یہاں سب ریڑھی بان، سبزی فروش یا نچلے درجہ کے ہنر مند لوگ تھے۔ وہ بھی اپنا ٹھیلا لے کر صبح سویرے نکل جاتا اور دن ڈھلے باسی روٹی کے ٹکڑوں، پلاسٹک کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں اور ردّی کاغذوں کے ساتھ داخل ہوتا، شروع دنوں میں مجھے ہمیشہ اُمید رہتی شاید اس کے ہاتھ میں میٹھا پان، کانچ کی چوڑیاں یا دہی بھلوں کی تھیلی ہو مگر یہ ہمیشہ اُمید ہی رہی وہ باہر سے آتا اور اپنی ماں کے پاس بیٹھ جاتا۔ اسکی ماں ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہی، گھر کے دوسرے حصوں کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے چھوٹے سے کمرے میں جہیز کے پلنگ پر بھی ہمارے درمیان موجود ہوتی۔

اماں سُن لے گی ۔۔۔۔

اماں کو بُرا لگے گا ۔۔۔۔

اماں کو یہ بات بالکل پسند نہیں ۔۔۔۔

یہ وہ چند جملے تھے جو ہمیشہ میرے اور اس کے درمیان موجود رہتے، بہت جلد اس سے اُکتا کر میں نے کاٹھ کباڑ کے کام میں پناہ ڈھونڈ لی۔ ہر روز میں گذشتہ دن کے کاٹھ کباڑ کو علیحدہ کرتی، اُنہیں مختلف بوریوں میں بھرتی، روٹی کے باسی ٹکڑوں کو مزید سکھاتی۔ لوہے، پلاسٹک اور ردی کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے اسے اس کی ماں کے ساتھ چھوڑ کر اپنی ٹوٹی کمر اور ازلی تنہائی کو لے کر پڑ جاتی۔ آٹھ سالوں میں اپنے تین پوتوں کا منہ دیکھ کر اس کی ماں جنت نصیب ہوگئی۔ شاید یہاں میرے اکیلے پن کا اختتام ہو ہی جاتا اگر اُسے میں نظر آتی، مگر ہمارے درمیان وہی اجنبیت کا تعلق قائم رہا، وہ صبح سویرے نکل جاتا اور شام کو خاموشی کے ساتھ اپنے بستر پر پڑا رہتا، اسی طرح روکھے پھیکے اگلے چار سالوں میں اس کا باپ بھی رخصت ہوا۔ گیارہ سالوں میں دو بیٹیوں کا اضافہ اور ہوا اور اب میں پانچ بچوں کے ساتھ اسّی گز کے اس پورے گھر کی مالک تھی۔ کاروبار بھی اب بہتر جا رہا تھا، گلی گلی ٹھیلا لے کر جانے کے بجائے اب اس نے گلی کے نکڑ والا پلاٹ خرید لیا تھا، اب ہمارے اپنے چار ٹھیلے چل رہے تھے، کئی کچرا چننے والے بچے بھی کام پر رکھ لئے تھے اور وہ خود اب باقاعدہ کباڑیا بن گیا تھا، روٹی، سبزی کے ساتھ اب ہفتے میں دو دن گوشت بھی پکنے لگا، بچے سرکاری اسکولوں میں جانے لگے، حالات میں بہتری آئی تو فاصلے بھی کم ہونے لگے۔ اماں کے نکل جانے سے جو خالی جگہ پیدا ہوگئی تھی وہ آہستہ آہستہ بھرنے لگی، میں اسے گلی محلے کے قصے چٹخارے لے لے کر سناتی، رشتہ داروں کی کمینگی کو بڑھا چڑھا کر بتاتی۔ اپنی سلیقہ مندی اور بچوں کی بہترین تربیت کے گن گاتی، پتا نہیں کہ وہ سُنتا تھا کہ نہیں مگر غنیمت تھا کہ وہ چپ چاپ میرے پاس بیٹھا رہتا، یا پھر تھک کر اپنے داہنے بازو کو آنکھوں پر رکھ کر لیٹ جاتا۔ میں کبھی اس کے دل کا حال جان ہی نہ پائی، کبھی میں شوخ ہو جاتی حسرت سے اس سے پوچھتی۔

سچ سچ بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو......؟

مگر اسکا ایک ہی جواب ہوتا

پاگل ہے کیا ۔۔۔۔ سونے دے۔۔

یوں ہمارے ازدواجی تعلق کو اٹھارہ سال بیت گئے اور ان اٹھارہ سالوں میں ایک دن پہلی بار اس نے مجھ سے پوچھا ۔۔۔

کچھ چاہیے تجھے ۔۔۔ بتا کیا لے گی ۔۔۔؟

وہ شاید خوشی یا حیرت کا ایک لمحہ تھا، مجھے کیا چاہیے تھا؟ اتنے سالوں میں میری خواہشیں دہی بھلوں، میٹھے پان اور کانچ کی چوڑیوں سے آگے کبھی گئی ہی نہیں تھیں اب جو اس نے پوچھا تو میں سوچ میں پڑ گئی۔

کیا مانگوں ؟ سونے کی انگوٹھی ۔۔ جیسی بھائی جان نے بھابی کو اوپر تلے پانچ بیٹیاں پیدا کرنے کے بعد بیٹے کی پیدائش پر دی تھی ۔ مجھے تو گھر کے اتنے بہت سے کام کرنے ہوتے تھے زیور کیسے پہن سکتی تھی، ریشمی جوڑوں کی مجھے عادت نہیں تھی، اُس کے ساتھ باہر جا کر کھانا کھانے کی خواہش بھی اکثر دل میں اٹھتی مگر یہ وہ ماننے والا نہیں تھا، ہماری برادری میں عورتوں کو باہر لے جانے کا رواج ہی نہیں ہے، میں ہمیشہ یہی سوچتی کہ وہ میری فرمائشیں پوری نہیں کرتا اور آج جب اس نے پوچھا تو مجھے خیال آیا کہ میری تو کوئی خواہش ہی نہیں اور میں اس موقع کو گنوانا بھی نہیں چاہتی تھی بالآخر بہت سوچ کر میں نے کہا کہ وہ مجھے اپنے بزنس میں شامل کر لے اب کی بار اس کی آنکھوں میں حیرت دیکھنے والی تھی۔

تو بزنس کرے گی ۔۔۔۔۔

وہ ہنسنے لگا ۔۔۔ اور یوں ہنستے ہوئے، میرے قریب بیٹھے ہوئے، اس طرح مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کتنا خوبصورت لگ رہا تھا ۔۔۔ اتنا خوبصورت ۔۔۔ اتنا اپنا سا کہ وہ اجنبیت جو اٹھارہ سالوں سے کسی عفریت کی طرح ہمارے درمیان موجود تھی جیسے یکدم ہی غائب ہو گئی

ہاں تو تم گھر میں جو کام مجھے لا کر دیتے ہو انہیں سے بھوسی ٹکڑے مجھے دے دو وہ اور زیادہ حیران ہوا، بھوسی ٹکڑوں کا کیا کرے گی تو ؟

میں جو بھی کروں، رکھوں یا بیچوں وہ میرے ہوئے یہ ایک قیمتی موقع تھا میں کیسے گنوا دیتی، وہ مان گیا۔ یوں میں اسکے بزنس میں بھوسی ٹکڑوں کی ساجھے دار بن گئی، جوں جوں اس کا کام بڑھتا گیا بھوسی ٹکڑے بھی بڑھتے گئے، پہلے میں نے یونہی بلا سوچے سمجھے ایک بات کہی تھی میں ان ٹکڑوں کو بکریوں کو ڈال دیتی یا نرم کر کے پانی میں بھگو کر چھت پر مٹی کے کونڈے میں رکھ آتی پرندوں کے لئے مگر جب ان کی تعداد بڑھنے لگی تو میں نے انہیں بیچنا شروع کر دیا، ابتداء میں ایک ہفتے میں چار پانچ روپے تک جمع ہو جاتے، پھر آہستہ آہستہ رقم بڑھنے لگی، وہ اتنا مہنگائی کا زمانہ نہیں تھا، مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں اس رقم کا کیا کروں پھر ایک دن پڑوس کی فریدہ اپنا ٹوٹا ہوا سونے کا چھلا بیچنے لگی اسے پیسوں کی ضرورت تھی اور سنار بہت کم رقم دے رہا تھا، ذرا سی زائد رقم دے کر فریدہ سے وہ چھلا میں نے خرید لیا۔ اور اسے جہیز کی اس بالشت بھر کی اس صندوقچی میں رکھ دیا جو ماں نے میری شادی پر خاص طور سے بنوا کر دی تھی کہ اس میں بُرے وقت کے لئے کچھ بچا کر رکھوں، پھر جیسے مجھے اس صندوقچی کو بھرنے میں مزہ آنے لگا، جب میرے پاس کچھ رقم جمع ہو جاتی میں کوئی نہ کوئی پرانا زیور خرید کر اسمیں بُرے وقت کیلئے ڈال دیتی۔

یوں ایک کم چالیس سال گذر گئے، میرے اور اس کے بیچ کی اجنبیت تقریباً ختم ہو چکی تھی، بیٹیاں بیاہی گئیں اور بہوئیں آ گئیں۔ پوتی پوتے انگلش اسکولوں میں پڑھنے لگے، محلہ وہی پُرانا تھا اور وہ اس محلے کا سب سے پُرانا کباڑی تھا، حالات بدل گئے تھے مگر اب اسے شناخت بدلنے کی لگ گئی تھی۔

جسے دیکھو کباڑیا کباڑیا نفرت ہو گئی ہے مجھے اس لفظ سے وہ غصے میں چلاتا، حالانکہ اس میں کوئی حرج نہیں تھا، ہم نے عزت کی زندگی گذاری تھی، بہت ساروں سے بہت بہتر، کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نسلیں کباڑیے کے نام سے مشہور ہوں مگر اس کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا؟

میں پرانے فرنیچر کا کام کروں گا۔ اب میں کباڑ کی جگہ پُرانا فرنیچر خریدوں گا، اور اُسے نیا کر کے کم داموں میں بیچ دیا کروں گا، تا کہ یہ منحوس کباڑیے کا لفظ ہمارے نام کے آگے سے ہٹ سکے، اس نے ارادہ کر لیا تھا اور میں اور میرے بیٹے اس کے ساتھ تھے ہمیشہ کی طرح..... انہی دنوں پتا چلا کہ علاقے کی سب سے بڑی پرانے فرنیچر کی دکان کا مالک اپنے بیٹوں کے پاس باہر ملک شفٹ ہو رہا ہے، اور دُکان کو فوری طور پر فروخت کر رہا ہے، قیمت بھی مناسب مانگ رہا تھا، لیکن یہ مناسب قیمت بھی ہماری پہنچ سے باہر تھی، ہم بہت عرصے سے اپنا کام کر رہے تھے مگر تھے تو کباڑیے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے کر سکتے تھے مگر یہ بات اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس پر جیسے کوئی نشہ سوار تھا، عمر کے آخری حصے میں اسے یہ کام کرنا ہی تھا، وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھا، زندگی بھر کی جمع پونجی داؤ پر لگانے پر تُلا ہوا تھا، اور اس سب کے بعد بھی قیمت ہماری پہنچ سے باہر تھی، پھر کچھ دن کی خاموشی کے بعد اس نے بتایا کہ وہ بیعانہ ادا کر چکا ہے، اور اب دو دن کے بعد اسے ہر حال میں پوری رقم کی ادائیگی کرنی ہے، سارا انتظام وہ کر چکا تھا اب صرف پانچ لاکھ روپے کم تھے

مگر اتنا ہم پانچ لاکھ کہاں سے لائیں گے اور اتنی رقم تو کوئی اُدھار بھی نہیں دے گا یہ میرا منجھلا بیٹا تھا، مگر اس نے سُنا ہی نہیں، وہ سنتا کب تھا، وہ سب کچھ پہلے ہی سوچ چکا تھا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا، لا مجھے پانچ لاکھ لا کر دے میں؟ مگر کیسے میرے پاس اتنے روپے نہیں ہیں،..... میں نے بتانے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے پاگل ہو گیا، تیرے پاس نہیں تو کس کے پاس ہیں بیس سال سے جو کنجوسی کر رہی تھی، میرا دیا کھا رہی تھی وہ اپنے یار پر لٹا بیٹھی ہے۔

میں اس کے منہ سے یہ الفاظ پہلی بار سُن رہی تھی اور جیسے حق دق بیٹھی تھی اسکی آنکھیں، اسکا لہجہ، آواز سب کچھ بدل چکے تھے، وہ... وہ نہیں تھا جس کے ساتھ میں پچھلے بیس سال سے رہ رہی تھی وہ ... وہ تھا جس کے ساتھ میں ایک کم چالیس برس پہلے بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی کوئی اجنبی ... نہیں وہ اجنبی تو خاموش رہتا تھا، جبکہ اس کی زبان زہر اُگل رہی تھی، لفظوں کے ناگ مجھے ڈس رہے تھے۔ میں نے بولنا چاہا مگر حلق خشک ہو چکا تھا، وہ چلا رہا تھا۔ مسلسل بے تکان۔ میں جیسے کھلے آسمان تلے کھڑی تھی اور جاڑے کی سرد رات میں میرے سر اولے پڑ رہے تھے۔ سُن ہوتی سماعتوں نے کچھ سُنا۔ ہاں شاید نہیں یقیناً وہ یہی بول رہا تھا اب تو یہاں کیا کر رہی ہے، تو بھی وہاں جا جہاں اپنا مال پہنچایا ہے، مکار عورت جا تین طلاقیں ہیں تجھے، کوئی تعلق نہیں تیرا میرا یہ الفاظ تھے ... نہیں کوڑے تھے ... میں بولنا چاہتی تھی .. بتانا چاہتی تھی ... میرے پاس روپے نہیں ... پُرانا زیور ہے جو میں پہلے ہی جہیز کی صندوقچی میں اسکے کپڑوں کی الماری میں رکھ چکی ہوں، میں بتانا چاہتی تھی کہ یہ میں نے بُرے وقت کے لئے رکھا تھا، اور اس سے برا وقت کیا ہو سکتا تھا، کہ اس کی سب سے بڑی خواہش پوری نہ ہو سکے ... میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کے کہے بغیر ہی اس کی خواہش جان چکی ہوں مگر وہ سنتا ہی کب تھا، میں اس کے لئے ایک اجنبی ہی رہی، اس نے میرے الفاظ کبھی نہیں سننے تو خاموشی کیسے سنتا، برسوں کا ساتھ تھا گھنٹہ بھی نہیں لگا ختم ہونے میں۔

ایمبولینس بھی آئی، میں ہسپتال بھی گئی، سفید کفن میں لپٹا بھی دی گئی، اور خاموشی سے سُن رہی آس پاس والی عورتیں مجھے بتا رہی تھیں کہ میں خوش قسمت ہوں کہ میری مٹی خراب ہونے سے بچ گئی، ورنہ اس عمر میں طلاق کے بعد کہاں جاتی، میں مر گئی یہ میرے حق میں بہتر ہوا، میں مٹی کی امانت تھی اور اسکے سپرد ہوئی، یوں میری کہانی ختم ہو گئی۔

لیکن کیا واقعی ؟

وہ تیسرا دن تھا جب وہ میری قبر پر پہلی بار آیا، اسے میرے جہیز کی صندوقچی مل گئی تھی اور زیوارت بھی .... وہ جان گیا تھا، کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی، اب وہ روز میری قبر پر آتا ہے، اس کا ماس تیزی سے ہڈیوں کو چھوڑ رہا ہے، وہ ہر روز پہلے سے زیادہ بوڑھا ہو رہا ہے، وہ جس نے کبھی مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کی تھی وہ اب گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں اس کی ہڈیوں میں بیٹھ گئی ہوں، اسے وہ ایک کم چالیس سال بھول گئے ہیں ہمارے بچے، رفاقتوں کے لمحے، میری بے سروپا باتیں بھی بھول گئی ہیں حد تو یہ ہے وہ " کنجس " بھی بھول گیا ہے جو اس سارے فساد کی جڑ بنا۔ اپنی شناخت، نیچ ذات اور معاشرے میں بلند مقام تک بھول گیا ہے بس یاد رہ گئی تو وہ میرے جہیز کی چھوٹی سی صندوقچی اور اس میں جمع شدہ کچھ پرانا ٹوٹا پھوٹا زیور۔ وہ بار بار یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کب کب میں نے اسے اس جمع پونجی کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس نے سنا نہیں تھا پھر وہ مجھ سے محبت کے وہ سارے الفاظ کہتا ہے جو اب اپنی وقعت کھو چکے ہیں وہ روتا رہتا ہے اور پوچھتا رہتا ہے کہ اسے مجھ سے محبت کب ہوئی ... اس نے کبھی مجھے سنتا ہی نہیں چاہا ... اور وہ آج بھی نہیں سنتا حالانکہ میں اسے بتاتی ہوں کہ "میرے سوئم والے دن جب تمہیں الماری میں میرے جہیز کی صندوقچی ملی تھی تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی تھی"

☆ موصولہ جرائد
☆ ادبِ لطیف
☆ خیال و فن
☆ زرنگار
☆ پیلوں
☆ انگارے
☆ سانجھاں
☆ تارکینِ وطن
☆ چہار سُو
☆ خوشبو

# ''توبہ کا دَر کُھلا ہے''

شازیہ محسن/ خانیوال

غزل لاہور کی رہنے والی تھی' وہ ایک معمولی فلمی اداکارہ تھی۔ فلمی حلقوں میں اس کا رقص بڑا مشہور تھا۔ وہ بڑا ہیجان انگیز رقص کرتی تھی۔ اسے ایک انتہائی مہلک مرض ''کینسر'' لاحق ہو گیا تھا۔ کینسر کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس نے اس مرض کے علاج کے لئے مختلف ماہرین طب سے رجوع کیا۔ لیکن ڈاکٹروں کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اسے اپنی زندگی کی کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ ہاں ایک اُمید باقی تھی اور وہ تھی اس کے رَب کا دروازہ اس کی یہ روداد اسی کی زبانی پیش ہے میں ایک عرصے سے اپنی ایک چھاتی میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ بڑا علاج کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ آخر ڈاکٹروں نے میرے کئی ٹیسٹ لئے جن کی روشنی میں یہ انکشاف ہوا کہ میں چھاتی کے کینسر کی شکار بن چکی تھی۔ اس مہلک مرض نے میری چھاتی میں اپنے پنجے گاڑ دیئے تھے اور میں پوری طرح اس موذی مرض کے شکنجے میں آ گئی تھی۔ اس وقت میں اللہ تعالیٰ سے اور دین کی تعلیمات سے بالکل غافل تھی۔ میں ایک مشہور فلمی اداکارہ تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ میرا حسن و جمال تاحیات میری شخصیت کو تازگی بخشتا رہے گا۔ مجھے ہمیشہ لطف اندوزی کا خوش کن موقع نصیب رہے گا۔ اور میں سدا بہار پودے کی طرح ہمیشہ تروتازہ رہوں گی۔ مجھے یہ خیال تک نہ گزرا تھا کہ میں بھی ''کینسر'' جیسی جان لیوا بیماری میں گرفتار ہو جاؤں گی۔ لیکن جب میں اس خطرناک مرض میں مبتلا ہوئی تو اس کے خوف و دہشت نے میرے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور میں بُری طرح حواس باختہ ہو گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں لیکن بھاگ کر جاتی تو کہاں جاتی؟ اس لئے میں نے سوچا کیوں نہ میں خودکشی کر لوں لیکن اپنی جان لینا کوئی آسان کام نہیں۔ پھر مجھے اپنے بچوں اور شوہر کا خیال آ گیا۔ مجھے اپنے شوہر اور بچوں سے شدید محبت تھی۔ اس لئے میں نے خودکشی کا خیال دماغ سے نکال دیا۔ اس وقت میرے خودکشی نہ کرنے کی وجہ اللہ تعالیٰ کا خوف یا ڈر نہ تھا۔ اس طرف تو کبھی خیال ہی نہیں گیا تھا۔ میں تو اسلام سے' اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کوسوں دُور تھی۔ میں توبہ و استغفار سے ناواقف تھی۔ جب مجھے یہ خطرناک مرض لاحق ہو گیا تو مجھے اللہ بھی یاد آ گیا اور اس کا رسول ﷺ بھی' میرا دھیان خود بخود توبہ و استغفار کی طرف چلا گیا۔ بعض اوقات بیماری بھی اِنسان کے لئے رحمت کا باعث ہوتی ہے اور اسے جھنجوڑ دیتی ہے۔ شاید اللہ چاہتا تھا کہ نہ صرف مجھ پر کرم کر کے سیدھے راستے پر لائے بلکہ اور لوگ بھی میری وجہ سے سیدھے راستے پر آ جائیں ہاں آج میں وہی غزل ہوں جو نجانے کتنے لوگوں کو گمراہ کر چکی تھی۔ اپنے جسم کی نمائش کر کے' رقص و سرود کے ذریعے' سینما کے ذریعے...... میں نے بہت ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔ سب نے میرے شوہر سے کہا کہ اس کے سینے کا متاثر حصہ کاٹ دینا ضروری ہے اور ایسی کیمیائی ادویات اور شعاعوں کا استعمال کرنا پڑے گا جس سے سر کے بال جھڑ جائیں گے' پلکیں اور بھنویں گر جائیں گی' چہرے پر داڑھی کے بال اُگ آئیں گے' ناخن اور دانت بوسیدہ ہو جائیں گے...... میں نے اس علاج سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں ایک چھاتی کٹوانے' گنجی ہونے اور قدرتی بناوٹ اور خوبصورتی کو داغدار کرنے پر مر جانے کو ترجیح دوں گی۔ میں پھر لاہور آ گئی' چھوٹا موٹا علاج کرواتی رہی۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے لگا کہ ڈاکٹروں نے میری درست تشخیص نہیں کی اور انہوں نے خوامخواہ میرے اندر کینسر کا مرض بتا دیا ہے جبکہ میں بالکل صحت مند ہوں۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے وزن میں خاصی کمی ہو چکی ہے۔ جب میں نے ایک مشہور ڈاکٹر سے طبی معائنہ کروایا تو اس نے مجھے بلجیم جانے کا مشورہ دیا میں نے بچوں کو ان کی پھوپھی کے گھر چھوڑا اور شوہر کے ساتھ بلجیم چلی گئی وہاں ڈاکٹروں نے جب میرا معائنہ کیا تو انہوں نے نہایت افسوس ناک خبر میرے شوہر کو بتائی کہ کینسر پوری چھاتی میں پھیل چکا ہے اور پھیپھڑے بھی اس سے بُری طرح متاثر ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس اب اس کے لئے کوئی علاج نہیں ہے۔ اب تمہارے لئے صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ تم اپنی بیوی کو پاکستان لے جاؤ تاکہ اُسے وطن میں موت نصیب ہو سکے۔ ڈاکٹروں نے جب میرے خاوند کو یہ اطلاع دی تو

ان پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ حواس باختہ ہوگئے پھر ہم لوگوں نے واپس اپنے وطن پاکستان جانے کی بجائے فرانس کا ٹکٹ لیا کہ شاید وہاں کوئی علاج ہو سکے۔ اور وہاں میں چھاتی کٹوا کر کیمیائی دوائیں استعمال کروں تا کہ کسی طرح زندگی بچ سکے ایک دن جب ہم پریشان بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اچانک میرے خاوند کے ذہن میں آیا کہ دُنیاوی علاج کروا چکے مگر ایک طبیب باقی رہ گیا ہے۔ اس کے پاس جانا چاہیے۔ اس نے جب مجھ سے بات کی تو جیسے مجھے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔ بلاشبہ ہمیں مکہ مکرمہ جانا چاہیے۔ بیت اللہ کی زیارت کریں اور وہاں اللہ کے دربار میں توبہ واستغفار کریں۔ اللہ سے دُعا کریں کہ اس مہلک مرض سے مجھے شفا دے۔ کیونکہ آسمان کے دروازے ہر سائل کے لئے ہر وقت کھلے ہیں اور وہاں ہر بیماری کا کامیاب علاج دستیاب ہے۔ چنانچہ ہم میاں بیوی پیرس سے خانہ کعبہ روانہ ہوگئے۔ راستہ بھر ہم "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا ورد کرتے رہے۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی کیونکہ بیت اللہ کی طرف میری زندگی کا یہ پہلا سفر تھا اور پہلی دفعہ اللہ کے گھر کا دیدار کرنے والی تھی۔ میں نے پیرس میں قرآن مجید کا ایک نسخہ خرید لیا تھا اور گاہے بگاہے اس کی تلاوت کرتی رہتی تھی۔ آخر وہ مبارک وقت آ گیا جب ہم مکہ مکرمہ پہنچ کر خانہ کعبہ میں داخل ہوگئے۔ جونہی نگاہ خانہ کعبہ پر پڑی میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ مجھے گزشتہ زندگی یاد آ گئی۔ رب کی نافرمانی اور گناہ آلودہ زندگی میں نماز' روزے سے قطعاً دُور رہی تھی۔ اب میں نہایت عاجزی کے ساتھ اس رب العالمین کے دَر پر حاضر تھی۔ جو دُعائیں قبول کرنے والا اور اپنے بندوں پر شفقت کرنے والا ہے میں نے خانہ کعبہ کے دروازے کے قریب جا کر رو رو کر یہ دُعا کی۔

"اے میرے پروردگار! میری مہلک بیماری کا علاج ڈاکٹروں کے بس میں نہیں' وہ ہزار ہا کوششوں کے باوجود میرے علاج سے انکار کر چکے ہیں۔ میرے پیارے اللہ! تیری طرف بیمار آئی ہوں اور اس کا علاج بھی تو ہی کرے گا۔ میری بیماری کے علاج کے معاملے میں ڈاکٹروں نے ہسپتالوں کے دروازے بند کر رکھے ہیں صرف تیرا دروازہ میرے لئے کھلا ہے۔ میں اپنے علاج کے لئے تیرے پاس پہنچ چکی ہوں' میرے رب! اپنا دروازہ میرے لئے بند مت کرنا" پھر میں نے بیت اللہ کا طواف کیا اور اس دوران میں اللہ سے دُعائیں کرتی رہی کہ اے اللہ! میری دُعا کو نامراد واپس نہ کرنا۔ مجھے نااُمید نہ کرنا اور مجھے شفا عنایت کر کے ڈاکٹروں کو اپنی عظمت وشان دکھا دینا" اس سے پہلے اللہ سے بالکل غافل تھی اور اس کیا احکامات پر کبھی عمل نہ کیا تھا لیکن اب میری وہ کیفیت نہ رہی جو پہلے تھی بلکہ اب میں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ میں نے مکہ مکرمہ میں اسلامی تعلیمات کی جانکاری حاصل کی اور کثرت سے قرآن پاک کی تلاوت کرنے اور زیادہ سے زیادہ اللہ عزوجل کا ذکر کرنے لگی۔ ہر وقت توبہ استغفار کا ورد جاری رہتا۔ مسجد حرام میں کافی راحت محسوس ہو رہی تھی اور میرے دل کو بہت ہی اطمینان تھا۔ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ آپ مجھے مسجد حرام میں ہی زیادہ وقت گزارنے کی اجازت دیں۔ میں ہوٹل میں کم ہی جاؤں گی اور زیادہ وقت اللہ کے گھر گزاروں گی۔ انہوں نے میری بات مان لی۔ اور میں اپنے اوقات مسجد حرام میں اللہ کے مقدس دربار میں دُعا ومناجات کے ساتھ گزارنے لگی۔ مسجد حرام کے اندر میرے پڑوس میں مصر اور ترکی کی چند خواتین تھیں جو میری تکلیف وآہ وبکا کو سنتی اور میرے آنسو دیکھتی تھیں۔ انہوں نے سبب دریافت کیا' میں نے ان سے کہا کہ بات یہ ہے کہ مجھے کینسر کی بیماری ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے دربار میں آہ وزاری کر رہی ہوں ان عورتوں کا معمول تھا کہ نمازوں کے بعد میرے اردگرد بیٹھ جاتیں اور خاصی دیر بعد الگ ہوتیں۔ یوں ہماری اللہ کے لئے آپس میں محبت ہوگئی پھر میں نے ان سے کہا کہ کیوں نہ میں مسجد میں اعتکاف کی نیت کرلوں۔ ان عورتوں کے خاوندوں نے بھی اجازت دے دی اور ہم سب اللہ کے گھر معتکف ہوگئیں۔ اب ہمارا سارا دن ذکر واذکار' قرآن پاک کی تلاوت' نمازوں اور نوافل میں گزر جاتا۔ اب ہم آب زمزم کثرت سے پیتیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد مجھے یاد تھا "آب زمزم جس نیت سے بھی پیا جائے تو وہ نیت پوری ہو جاتی ہے"

آب زمزم اگر بیماری سے شفا یابی کی نیت سے پیا جائے تو اللہ تعالیٰ شفا بخشتا ہے۔ اگر سیرابی کی نیت سے پیا جائے تو پیاس بجھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ کی نیت سے پیا جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے دامن میں پناہ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری بھوک کو زمزم کی برکت سے ختم کر کے ہمیں زندگی بخشی کچھ دن یونہی گزر گئے۔ ایک رات عبادت کے دوران میری

ادارہ بیاض کے زیر اہتمام الحمرا ہال نمبر 3 میں عہد حاضر کے نمائندہ شاعر ظفر اقبال کی صدارت میں رخشندہ نوید کے چوتھے شعری مجموعہ ''خامشی کو سن رہی تھی'' کی تقریب رونمائی ہوئی جس میں حسن عباسی، حمیدہ شاہین، اقبال راہی، اعجاز رضوی، ڈاکٹر غافر شہزاد، ڈاکٹر عمر عادل، غلام حسین ساجد، ڈاکٹر صغریٰ صدف، فرحت پروین، بشریٰ رحمٰن، نجیب احمد، عطاء الحق قاسمی اور صاحب صدارت ظفر اقبال نے رخشندہ نوید کے شعری مجموعہ پر اظہار خیال کیا۔ گفتگو کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ رخشندہ نوید اپنے عہد کی نمائندہ شاعرات میں شامل ہیں۔ انہوں نے صلہ و ستائش کی پرواہ کیے بغیر اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔ ان کی شاعری میں انسانی اور گھریلو رشتوں سے جنم لینے

# رخشندہ نوید کے شعری مجموعہ ''خامشی کو سن رہی تھی'' کی تقریب رونمائی

والی زندگی کی خوبصورت تصویریں ہیں۔ رخشندہ نوید کی شاعری میں خیالات کی تقلید نظر نہیں آتی، غزل ہو یا نظم ان کے ہاں اظہار اپنا شعری پیرہن ساتھ لے کر آتا ہے۔ ان کے شعری سفر پر ایک تخلیقی آپ بیتی کا گمان گزرتا ہے۔ انہوں نے انسانی جذبات کے بے محابا اظہار سے کبھی شہرت اور توجہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر غافر شہزاد نے کی اس سے قبل رخشندہ نوید کے تین شعری مجموعے ''پھر وصال کیسے ہو'' ''کسی اور سے محبت'' ''نیناں اترے پار'' شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک شعری انتخاب ''فیض سے وصی شاہ تک'' اور ویلنٹائن کے حوالے سے ان کی نظموں کا مجموعہ ایک کہانی کی صورت میں شائع ہوا۔ تقریب کے آخر میں رخشندہ نوید نے مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اپنی شاعری سنائی۔

# شاعر۔ ادیب۔ محقق ایم آر شاہد سے انٹرویو ✿ انٹرویو: نازاوکاڑوی

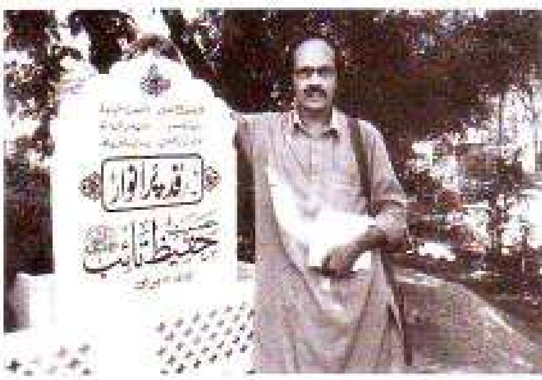

اصلی نام محمد ریاض شاہد ادبی نام ایم آر شاہد ولد محمد دین (مرحوم) 4 ستمبر 1961ء کو ہندوستان کے صوبہ مشرقی پنجاب کی آزاد ریاست مالیر کوٹلہ ضلع سنگرور میں پیدا ہوئے۔ تین جماعتیں اپنے آبائی علاقہ محلہ چورماراں کے مسلم پرائمری سکول سنامی گیٹ سے پڑھیں۔ ستمبر 1969ء میں بھارت کو خیر آباد کہہ کر اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ پاکستان چلے آئے۔ یہاں مزنگ لاہور میں سکونت اختیار کی اور ایم سی پرائمری سکول وارث روڈ لاہور میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا ور 1973ء میں پرائمری پاس کی۔ اب یہاں سکول کی جگہ بلند و بالا عمارت گورنمنٹ میاں نواز شریف گرلز کالج واقع ہے۔ میٹرک کا امتحان 1978ء میں گورنمنٹ مزنگ ہائی سکول سے پاس کیا۔

27 اپریل 1981ء میں محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کی اس وقت اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ ادبی سرگرمیوں کا آغاز اس سے قبل شروع کر چکے تھے۔ پھر ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے علمی' ادبی ذوق کی تشکیل کے لئے ادبی حلقوں سے منسلک رہے۔ اردو اور پنجابی میں مختلف قومی اخبارات وادبی جرائد میں مضامین' فیچر'

انٹرویوز لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔ ستمبر 2003ء میں پہلی کتاب ''لاہور میں مدفون مشاہیر'' جو لاہور کے ایک سو پانچ قبرستانوں کی تحقیق پر مبنی ہے شائع ہوئی۔ دوسری کتاب جولائی 2004ء کو ''شہر خموشاں کے مکیں'' منظر عام پر آئی جس میں اسلام آباد' راولپنڈی (ڈویژن) کی زمین کی آغوش میں سوئی ہوئی نامور ہستیوں کی تحقیق شامل ہے۔ تیسری کتاب فروری 2006ء میں ''شہیدان وطن کے'' کے نام سے مارکیٹ میں رونما ہوئی۔ جس میں شہدا وطن کے حالات' زندگی تحریر کیے گئے ہیں۔ جبکہ چوتھی کتاب ''لاہور میں مدفون مشاہیر (جلد دوم) جون 2008ء'' اور پانچویں کتاب جنوری 2011ء میں ''شہدائے پنجاب پولیس'' شائع ہوئی جبکہ چھٹی کتاب مارچ 2012ء میں ''کراچی میں مدفون مشاہیر'' شائع ہوئی۔ ساتویں کتاب سفر نامہ حج اشاعت ستمبر 2013ء آٹھویں کتاب ''لاہور کے اہل قلم کا تذکرہ'' اشاعت اگست 2014ء قبرستانوں پر تحقیق کی بناء پر پاکستان کے بہت سے ٹی وی چینلز نے ان کے انٹرویوز اور قبرستانوں پر ڈاکومنٹریاں بنائیں۔ جو اندرون و بیرون ممالک میں بہت پسند کی گئیں۔ ان چینلز میں جیو نیوز' ایکسپریس ٹی وی' سماء ٹی وی' چینل ۵' پی ٹی وی ہوم' سوچ وچار (پنجابی پروگرام)' رائل ٹی وی' C-42 چینل' جیو کا مشہور پروگرام ایک دن جیو کے ساتھ 31 اکتوبر 2014ء کو (قبرستان میانی صاحب کے حالات وواقعات) شامل ہیں۔

مرکز علم وفن کے چیئرمین کے علاوہ ملک کی بہت سی ادبی تنظیموں کے رکن عہدیدار ہیں۔ جن میں ورلڈ پنجابی کانگریس' ممبر اکادمی ادبیات پاکستان' رکن پاکستان رائٹرز گلڈ پنجاب' ممبر ادبی بیٹھک الحمراء لاہور شامل ہیں۔ 2011ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ 14 اگست 2011ء کو ان کی تحقیقی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے (تمغہ امتیاز) کا اعلان کیا جو 23 مارچ 2012ء کو یوم پاکستان کے موقع پر عطا کیا گیا۔ اب ان کی نظریں پورے پاکستان کی سرزمین میں آسودہ خاک خوبصورت ہستیوں کی تحقیق پر جمی ہیں۔

طالب دعا
ایم آر شاہد (تمغہ امتیاز)
12 پنج محل روڈ' مزنگ لاہور کوڈ 54000'
موبائل نمبر: 0300-4302549
فون رہائش: 0423-6311763

بقیہ اندرونی صفحات پر

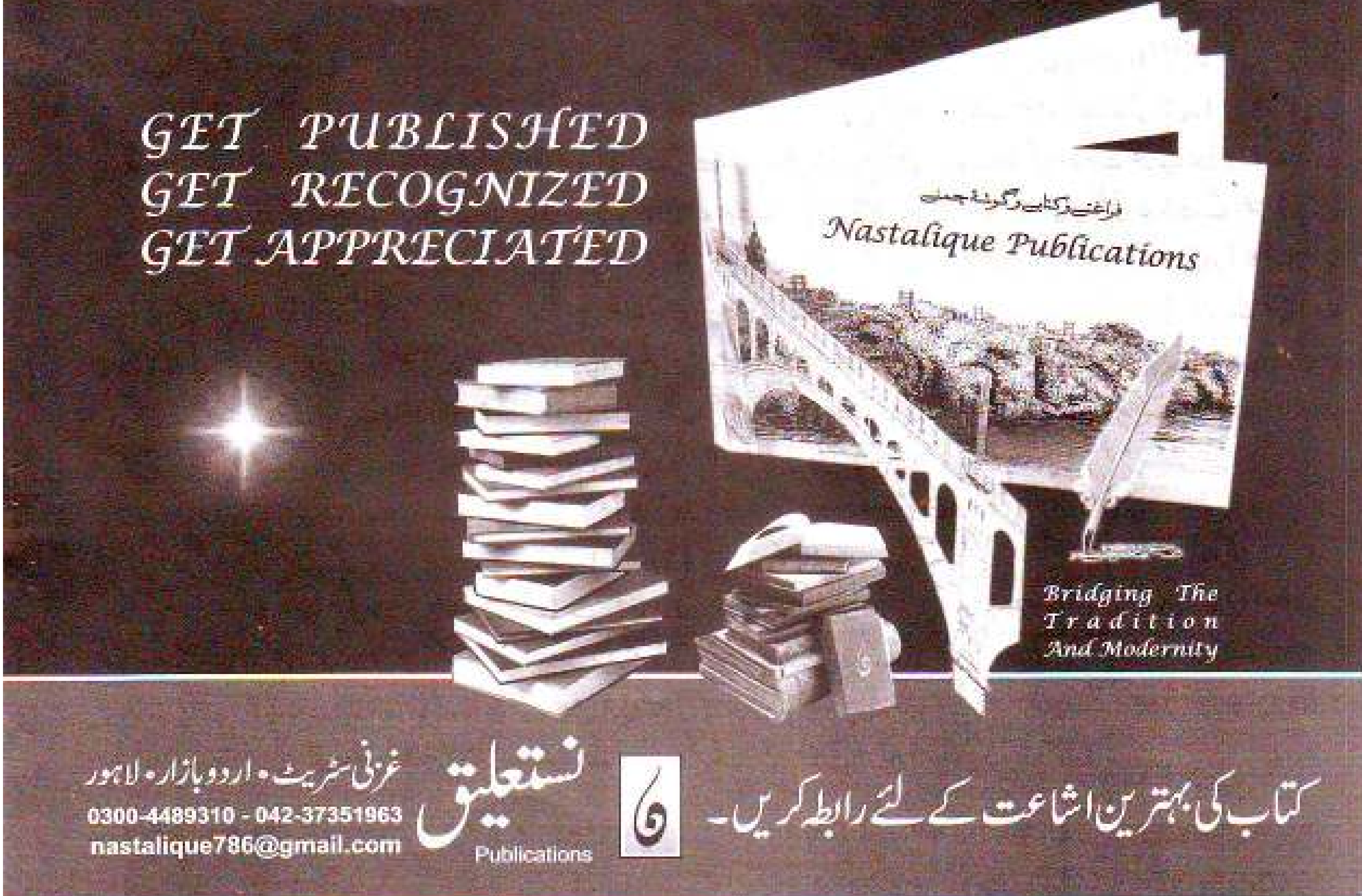

GET PUBLISHED
GET RECOGNIZED
GET APPRECIATED
Nastalique Publications
Bridging The Tradition And Modernity
کتاب کی بہترین اشاعت کے لئے رابطہ کریں۔
نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ ۔ اردو بازار ۔ لاہور
0300-4489310 - 042-37351963
nastalique786@gmail.com


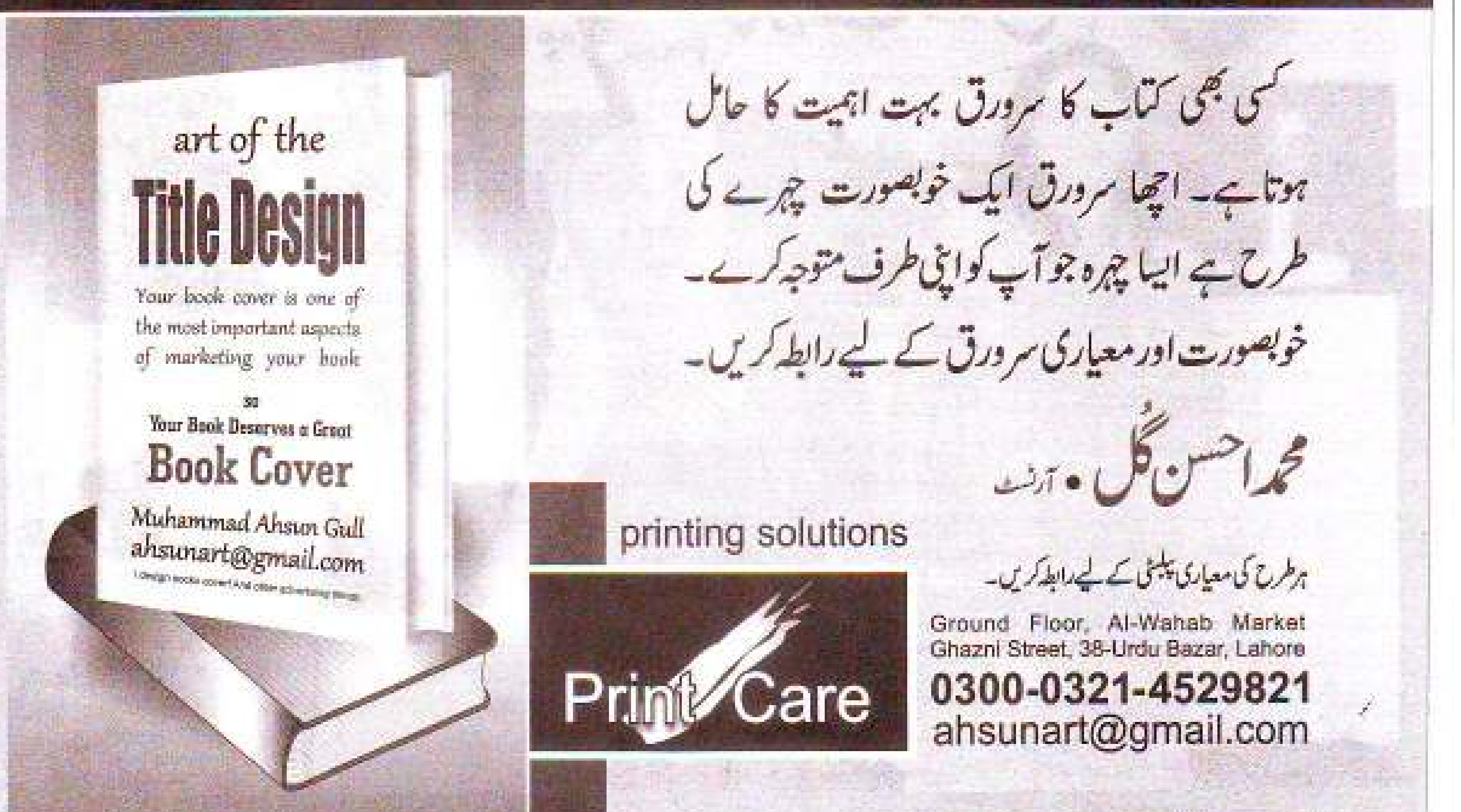

art of the
Title Design
Your book cover is one of the most important aspects of marketing your book
so
Your Book Deserves a Great
Book Cover
Muhammad Ahsun Gull
ahsunart@gmail.com
کسی بھی کتاب کا سرورق بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اچھا سرورق ایک خوبصورت چہرے کی طرح ہے ایسا چہرہ جو آپ کو اپنی طرف متوجہ کرے۔
خوبصورت اور معیاری سرورق کے لیے رابطہ کریں۔
محمد احسن گُل ۔ آرٹسٹ
printing solutions
ہر طرح کی معیاری پبلسٹی کے لیے رابطہ کریں۔
Print Care
Ground Floor, Al-Wahab Market
Ghazni Street, 38-Urdu Bazar, Lahore
0300-0321-4529821
ahsunart@gmail.com

آنکھ لگ گئی۔ میں نے خود کو مدینہ میں روضہ رسول ﷺ پر حاضری دیتے دیکھا۔ میری آنکھ نے گنبد خضریٰ کا دیدار کیا۔ آنکھ کھلی تو دل میں ایک تڑپ اور لگن تھی کہ میرا علاج کالی کملی والے آقا ﷺ کے در اقدس پر ہے۔ اس روضہ اقدس کی عظمت کا خیال آیا جس پر زمین ناز کرتی ہے' کائنات فخر کرتی ہے۔ انسانیت کو قرار اور سکون ملتا ہے مجھے احساس ہوا کہ دُنیا کی ہر پریشانی کا حل تمام مصائب کی دوا' تمام دُکھوں کا علاج کالی کملی ﷺ والے کے روضہ کی چھاؤں میں ہے۔ بس پر کیا تھا۔ اگلے دن ہم مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

لرزاں و ترساں آقا ﷺ کے در پر حاضری دی۔ اپنے گناہوں میں ڈوبے وجود کے ساتھ قدم قدم آگے بڑھتی رہی۔ پھر دھڑکتے دل کے ساتھ روضہ رسول ﷺ کی جالیوں سے لپٹ گئی۔ شرمندگی اور ندامت کے آنسوؤں سے ان مقدس جالیوں کو بھگونے لگی۔ اپنے کئے پر پچھتانے اور فریاد کرنے لگی' یارسول اللہ ﷺ! '' مجھے معاف کر دو۔ میں بھول گئی تھی' میں نے لالچ کا کاروبار شروع کیا' دُنیا بناتے ہوئے اپنی عاقبت بھول گئی۔ میں گناہ گار ہوں' روسیاہ ہوں' مگر شکر ہے کہ تیری اُمت سے ہوں'' مجھے تیری رحمت پر بھروسہ ہے تیرے کرم کا آسرا ہے خدارا کرم کی اک نظر ادھر فرمایئے ورنہ زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ مجھے اپنے کئے پر ندامت ہے۔ شرمندگی سے سر نہیں اُٹھا سکتی۔ ندامت سے بات نہیں کر سکتی۔ میں دولت کی ہوس سے توبہ کرتی ہوں...... تیرا در بار گناہ گاروں کے لئے کھلا رہتا ہے۔ سیاہ کاروں کو معاف کرنا تیری فطرت ہے۔ میرے مولا! میں نے حقیقت کو دیکھ لیا ہے۔ تیری عظمت کو پہچان لیا ہے۔ میں اپنے گناہوں سے تائب ہوتی ہوں۔ میرے مولا...... میرے آقا ﷺ!......''

روضہ رسول ﷺ پر حاضری سے دلی سکون ملا پھر واپس مکہ آ گئی۔ میری سہیلیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جسم کو آب زمزم سے دھو ڈالوں۔ میں نے انکار کیا مگر مجھے محسوس ہوا کہ کوئی اندرونی طاقت مجھے آب زمزم سے اپنے جسم کو دھونے پر آمادہ کر رہی ہے میں نے آب زمزم کی بے ادبی کے خوف سے اس پر عمل نہیں کیا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے اپنا جسم نہیں دھویا کیونکہ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ جب تیسری مرتبہ میرے دل نے گواہی دی اور مجبور کیا تو میں اُٹھی اور آب زمزم لے کر اپنے ہاتھوں سے جسم اور چھاتی پر موجود پھنسیوں پر پھیرنا شروع کر دیا جو کہ فاسد خون اور پیپ وغیرہ سے پر تھیں۔ چند دنوں میں دیکھتے ہی دیکھتے میرا جسم حیرت انگیز طور پر ان تمام بیماریوں سے پاک ہونے لگا۔ چھوٹی چھوٹی پھنسیاں جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ جسم کو شل کر دینے والے درد والم سب غائب ہو گئے۔ میں پہلے تو بے یقینی کی کیفیت میں رہی کہ یہ میرا واہمہ ہے۔ پھر میں اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر بار بار جسم کو چھونے لگی۔ لیکن میرے جسم کے کسی حصے میں اب ہرگز کوئی سوجن نہیں تھی۔ میں کانپ اُٹھی۔ فوراً میرے ذہن نے کہا تعجب' کیوں کر رہی ہو' کیا اللہ اس کام پر قادر نہیں؟ میں نے اپنی سہیلی سے کہا کہ میرے جسم سے اب تمام پھنسیاں غائب ہیں اور میرا جسم صحیح وسالم ہو گیا ہے تو وہ بے ساختہ پکار اُٹھیں ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' میں فرط مسرت سے اپنے شوہر کو خوش خبری دینے کے لئے مسجد حرام سے نکل کر ہوٹل کے لئے چلی کمرے میں داخل ہو کر جب اپنے شوہر کے سامنے کھڑی ہوئی ان سے کہنے لگی کہ دیکھو دیکھو یہ اللہ کی رحمت...... کہاں ہیں میرے جسم پر پھوڑے اور پھنسیاں ......؟ ختم ہو گئیں ناں! اور یہ سب متبرک اور پاک آب زمزم کی برکت سے ہوا پھر میں نے مسرت و شادمانی کے ساتھ اپنے شوہر کو اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ لیکن وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔ یکا یک اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ '' کیا تجھے معلوم نہیں۔ کیا تو اتنی جلدی بھول گئی کہ صرف تین ہفتے قبل ڈاکٹروں نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ یہ چند ہی دنوں کی مہمان ہے؟''

'' زندگی اور موت کا وقت اللہ کے ہاتھ میں ہے'' میں نے جواباً کہا۔ '' غائب کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ کب کسی کو موت آنی ہے' یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اس کے بعد ہم میاں بیوی بیت اللہ میں ایک ہفتہ قیام پذیر رہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی ان گنت نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتی رہی اور اس کی حمد و ثنا بیان کرتی رہی۔ پھر ہم نے دوبارہ مدینہ در رسول ﷺ پر شکرانے کی حاضری دی اور مسجد نبوی کی زیارت کی۔ اور اس کے بعد فرانس واپس ہو گئے۔ جب وہاں کے ڈاکٹروں نے مجھے پوری طرح صحت مند دیکھا تو وہ حیران رہ گئے۔ میرے تمام ٹسٹ دوبارہ لئے گئے تو نتیجہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگے۔ ''محترمہ! کیا آپ ہی وہ خاتون ہیں جو......''

''جی ہاں میں وہ خاتون ہوں جس کی موت کا آپ لوگوں نے اعلان کر رکھا تھا'' میں نے فخر سے جواب دیا۔ ''اور یہ میرے شوہر ہیں جنھوں نے میری شفایابی کے لئے اپنے سارے وسائل استعمال کر ڈالے تھے۔ آپ لوگوں کے علاج سے بے زار ہو کر ایک نئے ہسپتال میں جا کر داخل ہوگئی اور اب وہاں کے علاج سے شفایابی کے بعد واپس آئی ہوں مجھے اب کسی کا خوف اور ڈر نہیں سوائے کوئی نہیں جانتا اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اس کے بعد ہم میاں بیوی بیت اللہ میں ایک ہفتہ قیام پذیر رہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی اَن گنت نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتی رہی اور اس کی حمد و ثنا بیان کرتی رہی۔ پھر ہم نے دوبارہ مدینہ در رسول ﷺ پر شکرانے کی کئی حاضریاں دی اور مسجد نبوی کی زیارت کی۔ مجھے اب کسی کا خوف اور ڈر نہیں سوائے اللہ کے...... کیونکہ قضا و تقدیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی زندگی و موت کا مالک ہے اور تمام امور اس کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔ ایک پتا بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں گرتا ہے''

ڈاکٹروں نے مجھ سے کہا ''محترمہ! آپ کا یہ معاملہ عجیب و غریب ہے۔ تعجب ہے آپ کی بیماری ختم ہوگئی اور آپ مکمل طور پر صحت یاب ہوگئیں۔ آپ کینسر جیسے خطرناک مرض میں گرفتار تھیں۔ براہ کرام! آپ ہمیں بتائیں کہ وہ کون سی ادویات تھیں جن کے علاج سے آپ کی یہ مہلک او خطرناک بیماری دفع ہوگئی''۔

کون سی تھی وہ دوا............؟

میں نے بڑے یقین و اعتماد کے ساتھ صرف اتنا کہا کہ اس دوا کا نام ''آبِ زمزم'' ہے۔''

## گوشہ

## خادم علی انجم/لاہور

کٹتی نہیں ہے رات مگر تم کو اس سے کیا
کرتا ہے سائیں سائیں یہ گھر تم کو اس سے کیا
کھو ہی نہ جانا تم کہیں دُنیا کی بھیڑ میں
مجھ کو اکیلے لگتا ہے ڈر تم کو اس سے کیا
تم میری جان دُور ہو اور دُور بھی بہت
لیکن ہے آنکھ میری جو تر تم کو اس سے کیا
پاؤں تمہارا ساتھ جو دُنیا کو چھوڑ دوں
پر ہے تمہاری آنکھ میں زر تم کو اس سے کیا
وہ جو فقط ترے لیے زندہ ہے جانے من
دُنیا کے ہاتھوں جائے وہ مر تم کو اس سے کیا

کل شب یہ میری دل سے بڑی گفتگو رہی
ملنے کی زندگی سے بڑی جستجو رہی
تم آئے اور آکے چلے بھی گئے صنم
اب کے بھی تم سے ملنے کی بس آرزو رہی
بدلیں روش ہم اپنی بھلا کس طرح بتا؟
جب کہ ترے ستم کی پرانی ہی خو رہی
توبہ شبِ وصال کا عالم نہ پوچھیے
ایسا وصال جس کی نہ پھر جستجو رہی
تو خواب ہے خیال ہے ارماں ہے میرا تو
انجمؔ تلاش تیری مجھے چار سو رہی

بھلا اب میں کب تک تجھے یاد رکھوں
کہاں تک میں اس دل کو ناشاد رکھوں
تری بے رخی ہے مقدر ہمارا
تو کب تک میں یہ زندگی شاد رکھوں
تری یاد آتی ہے ساون رتوں میں
کہ دل کو کہاں تک میں برباد رکھوں
فضاؤں سے بارود کی بُو ہے آتی
تو کیوں دل کبوتر کو آزاد رکھوں
جب اپنا لہو ہاتھ پر دیکھتا ہوں
تو کیسے زباں پر میں فریاد رکھوں
جلایا ہے جس حُسن نے کوہ سینا
میں اس برق کی اِک چمک یاد رکھوں
اگرچہ ہے انجمؔ خرابیٔ قسمت
مگر تجھ سے شکوۂ بیداد رکھوں

پتہ نہیں کیوں مجھ کو اس کی یاد ستاتی ہے
جو نظروں سے چُھپ چُھپ کر مجھ کو تڑپاتی ہے
وہ خوابوں میں ملنے مجھ کو آتی ہے اکثر
اور میری بیداری سے پھر روٹھ بھی جاتی ہے
اس کی یاد بھی قاتل ہے میری تنہائی کی
حشر اُٹھاتی ہے جب مجھ کو تنہا پاتی ہے
برسوں اس کی یاد نہیں آتی مجھ کو لیکن
جب یاد اس کی آتی ہے تو اکثر آتی ہے
سُنا ہے وہ بھی کھوئی کھوئی رہتی ہے انجمؔ
شاید اب بیتے لمحوں کی یاد ستاتی ہے

# خالد علیم/لاہور

ماہنامہ ''فانوس'' لاہور کا منچندا بانی نمبر محمد شکور طفیل اور خالد علیم کی زیرِ ادارت شائع ہو گیا ہے۔ یہ نمبر بھارت کے معروف اور منفرد لب و لہجے کے شاعر منچندا بانی کے فکر و فن اور شاعری کے انتخاب سے آراستہ ہے۔ منچندا بانی تقسیم سے قبل ملتان (پاکستان) میں 1932ء میں پیدا ہوئے اور ہجرت کے بعد دہلی (بھارت) میں آباد ہو گئے تھے۔ 49 سال کی عمر میں 1982ء میں دہلی ہی میں انتقال کیا۔ بھارت کے ادبی حلقوں میں وہ ایک اہم غزل گو شاعر کی حیثیت سے متعارف تھے۔ وہاں اُن کا شمار اپنے عہد کے نمایاں شعرا میں ہوتا تھا۔ 1983ء تک ان کے تین عدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں پہلی بار ان کی خدمات کا اعتراف ماہنامہ ''فانوس'' کے ذریعے کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں جہاں معروف نقاد گوپی چند نارنگ' گوپال متل' شمس الرحمٰن فاروقی' عتیق اللہ' مظفر حنفی' مغنی تبسم' ڈاکٹر ممتاز الحق اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ کے گراں قدر مضامین شامل کیے گئے ہیں' وہیں نوجوان لکھاریوں میں ارشد نعیم' نوید صادق اور شاہد ماکلی کے مقالات بانی کے فکر و فن کو محیط ہیں۔ اس نمبر کا گراں قدر حصہ بانی کی 80 عدد سے زیادہ وہ غزلیں ہیں جو بھارت کے نوجوان اہلِ فکر و فن: تصنیف حیدر اور اعجاز عبید کے حسنِ انتخاب کا ثمر ہیں۔ آخر میں بانی کی چند ایک نظمیں اس نمبر کی زینت ہیں۔ فانوس کے اس نمبر کا اداریہ ''شعاعیں'' بھی بانی کی شخصیت و فن کے حوالے سے دعوتِ فکر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر بانی کے فکر و فن پر اس یادگار نمبر کے 160 صفحات میں بہت کچھ سمیٹا گیا ہے۔ فانوس کا یہ خصوصی شمارہ اُردو دنیا میں بانی کی شخصیت اور فن کو متعارف کروانے میں یقیناً اہم کردار ادا کرے گا۔ ضخامت' معیارِ طباعت اور کمپوزنگ اور ٹائٹل کی دیدہ زیبی کے اعتبار سے اس کی قیمت صرف 100 روپے ہے اور دفتر ماہنامہ فانوس' 11۔ امتیاز چیمبرز' ٹیمپل روڈ' نزد عابد مارکیٹ لاہور کے علاوہ معروف بک سیلرز سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اُنھیں تو کہہ مرے شہر کے اُجالوں سے
کرو نہ کوئی شکایت چراغ والوں سے
کئی دنوں سے ہم اپنے ہی عکس میں گم ہیں
کلام کیا ہو ترے آئینہ مثالوں سے
ٹھٹھرتے وقت کے اے آفتاب دیکھ کر ہم
جھلس گئے ہیں ترے آتشیں سوالوں سے
تجھے یہ کیسے بتائیں کہ گھر کی دیواریں
لرزنے لگتی ہیں کیوں مکڑیوں کے جالوں سے
کسے کہیں کہ ہم ایسے بھی ہیں مگر کیوں ہیں
بھرا پڑا ہے زمانہ شکستہ حالوں سے
اسیرِ درد' رگِ سنگِ شب سے کیا نکلے
لہو سا پھوٹ رہا ہے سحر کے گالوں سے
ابھی زمیں کی کشش ہی سے ہم نہیں نکلے
کریں گے بات کبھی آسمان والوں سے
بہت چلے سرِ ہر شیشہ زار ہم خالد
نجات پا نہ سکے پاؤں چھالوں سے

---

اگر یہ عشق ہے' اس کا اعادہ ٹھیک نہیں
یہ کم تو ٹھیک ہے لیکن زیادہ ٹھیک نہیں
وہ بول اُٹھا' ذرا یہ بتاؤ' دل کیا ہے
کہا جو میں نے بدن کا لبادہ ٹھیک نہیں
چلو فریبِ نظر ایک بار' دوسری بار!!
یہ بار بار تو اے مردِ سادہ ٹھیک نہیں
ذرا سی وسعتِ ہفت آسماں ضروری ہے
سوادِ جاں کو دلِ کم کشادہ ٹھیک نہیں
تمہاری دید کی جاں دادگاں کو فرصت کیا
نہ یوں کہو کہ ہمارا ارادہ ٹھیک نہیں
نبھا رہے ہو اُسے چشم و دل پہ آئنہ بار
یہی نبھاؤ تو اے ہجر زادہ! ٹھیک نہیں
مجھے کہو سو کہو' دوسروں پہ رائے نہ دو
میاں یہ بات تمہاری زیادہ ٹھیک نہیں
ملیں گے ہم کبھی خالد سے اور دیکھیں گے
یہ آدھا ٹھیک ہے' کہتے ہیں' آدھا ٹھیک نہیں

---

نواحِ جاں میں گر ایک شب تماشا ہو
مسافرانِ سحر کو غضب تماشا ہو
کوئی صدا ہے رگِ جاں کو کاٹنے والی
پڑے جو لوحِ یقیں پر' عجب تماشا ہو
ہمارے چاہنے سے کیا ہوا ہے پہلے بھی
کسی کی چشمِ عطا کا جو اب تماشا ہو
سحر نما وہ دریچہ' قدم قریب وہ در
یہ دیکھ لو' نہ کہیں سب کا سب تماشا ہو
خبر نہیں کہاں گردشِ زمیں کی رُک جائے
ستارے ٹوٹ پڑیں اور کب تماشا ہو
جو سب ہی یوں ہیں تو خالد کہیں نہ ہو ایسا
تمام شہر کا نام و نسب تماشا ہو

---

ایک کنارہ جنوں' ایک کنارہ ترا
یوں ہی کہیں کٹ گیا ساتھ ہمارا ترا
خیر نکل آئی تھی قدر کوئی مشترک
رات مری زندگی' چاند نظارہ ترا
تیری صفت کیمیا' میرے مقدر میں راکھ
جسم مرا برگِ کاہ' آنکھ شرارہ ترا
یہ جو اسیری نہیں اور اسیری ہے کیا
جاں پہ ترا اختیار' دل پہ اجارہ ترا
ایک ازلی درد سے شام اُٹھائی گئی
ایک ابدی شام نے خواب اُتارا ترا
کیا تھی حقیقت نہ پوچھ' اس کی اذیت نہ پوچھ
کیسے گوارہ کیا ہم نے خسارہ ترا
اے فلکِ ہجر دیکھ' دیکھ مری آنکھ سے
کتنی تگ و دو کے بعد بوجھ اُتارا ترا
خالد اگر زندگی' تجھ کو فقط ایک تھی
کیسے خیال آ گیا مجھ کو دوبارہ ترا

# سیّد مقبول حسین/راولپنڈی

شہر کچھ ایسے پرایا ہُوا لگتا ہے مجھے    ہر کوئی دُور ہُوا لگتا ہے مجھے

شہر کچھ ایسے پرایا ہُوا لگتا ہے مجھے
ہر کوئی دُور سے آیا ہُوا لگتا ہے مجھے
جو بھی اُڑتا ہے پریشاں سا نظر آتا ہے
پیڑ میں جال چھپایا ہُوا لگتا ہے مجھے
پوچھنا چاہتے ہو اس کا بدن کیسا ہے
دُودھ میں شہد ملایا ہُوا لگتا ہے مجھے
کیوں ہر اک شخص سے دُشمن کا گلہ کرتے ہو
وہ تو یاروں کا ستایا ہُوا لگتا ہے مجھے
دُھوپ میں دھندلے نظر آتے ہیں چلتے ہوئے لوگ
آنکھ پر ابر سا چھایا ہوا لگتا ہے مجھے
لوگ اُڑتے نظر آتے ہیں ہوا میں مقبولؔ
ریت پر شہر بسایا ہُوا لگتا ہے مجھے

---

بہار رُت سے دُعا کا اثر زیادہ ہے
شجر پہ پہلے سے اب کے ثمر زیادہ ہے
اسی لئے ہمیں سُورج سے ڈر نہیں لگتا
یہ چھاؤں چھاؤں نہیں ہے شجر زیادہ ہے
کچھ اس لئے بھی مجھے قید رہنا پڑتا ہے
مری زمیں پہ فلک کی نظر زیادہ ہے
میں چاہتا ہوں کوئی مجھ کو آ کے لے جائے
مری طلب سے مرا رزق گر زیادہ ہے
جو ہو سکے تو مجھے میرے قد میں رہنے دے
میں کیا کروں تری قامت اگر زیادہ ہے

---

جب ترے نزدیک آ جاتا ہوں میں
فاصلے ہی فاصلے پاتا ہوں میں
کرتو لی صورت گری تیری مگر
انگلیوں کے زخم سہلاتا ہوں میں
لمس اک احساس ہے اور کچھ نہیں
اس کے رنگوں میں بہا جاتا ہوں میں
خیمہ زن ہیں مجھ میں کیا نیرنگیاں
زندگی کا شوق کہلاتا ہوں میں
میں کہیں در اور دریچے کی طرح
اور کہیں دیوار بن جاتا ہوں میں

---

عمر بھر ایک خواب میں رکھا
دل نے کس اضطراب میں رکھا
خود تو اندھے ہوئے اندھیرے سے
آئنہ آب و تاب میں رکھا
میں نے تحفہ لکھا چراغ اُسے
پھول اُس نے جواب میں رکھا
خود میں محصور ہو گیا ہوں میں
تو نے یہ کس حجاب میں رکھا
وہ گری بوند بوند اور کہیں
جس ہوا کو سحاب میں رکھا
ہر طرف بس تری ہی خوشبو ہے
خط کو جب سے کتاب میں رکھا
رُت بدلنے لگی مگر وہ شخص
رہ گیا ہے گلاب میں رکھا

---

جو خود کو طاق میں رکھ کر کہیں چھپاؤں گا
چراغ کو میں ہوا میں کہاں جلاؤں گا
غمِ حیات سے فرصت ذرا سی ملنے دے
میں اپنی ساری کہانی تجھے سناؤں گا
اُگا کے پھول پریشان ہو رہا ہوں میں
ہوا چلے گی تو خوشبو کہاں چھپاؤں گا
وہ جس کی لو کا اُجالا رہے ابد آثار
میں اپنی خاک سے ایسا دیا بناؤں گا
یہ آنکھ میں جو امڈ آئی آنسوؤں کی قطار
میں اتنے پیڑ زمیں میں کہاں اُگاؤں گا
مری زمین پہ بارش اُتار ورنہ میں
اُگے گی بھوک تو پھر جسم اپنا کھاؤں گا
بدن جو تو نے مجھے دے دیا ہے مٹھی بھر
یہ خاک ہے تو اسے خاک میں اڑاؤں گا
نکال دے گا مجھے دل سے تُو اگر مقبولؔ
میں تیری آنکھ کے دریا میں گھر بناؤں گا

# عارف فرہاد/ راولپنڈی

موسمِ نارسائی عارف فرہاد کا تازہ مجموعۂ کلام ہے۔ زندگی اور اس کے متنوع رنگ اس مجموعے میں رقصاں ہیں۔ عصری سماجی مسائل بھی اس کے تخلیقی اظہاریے کا اہم موضوع ہیں اور زندگی کے جمالیاتی اشاریے بھی اس کے وجدانی اور مشاہداتی دائرے سے باہر نہیں۔ فکر و فرہنگ کا اتنا خوش آہنگ امتزاج اس مجموعے کا ایسا وصف ہے' جو عارف فرہاد کو معاصر شعراء سے منفرد بھی کرتا ہے اور ممتاز بھی۔ اس کی غزل جدید تو ہے ہی...... مگر اس کا داخلی رشتہ کلاسیک اور روایت سے بھی استوار ہے۔ وہ لفظ کے انتخاب اور اس کے برمحل استعمال پر بھی ماہرانہ دسترس رکھتا ہے اور یوں اس کی غزل لفظ سے معانی تک کے تخلیقی سفر میں ایک نئے رنگ اور آہنگ کی ترجمان ہے۔ اور یہی رنگ اور آہنگ اس کی شناخت بھی ہے اور پہچان بھی۔

مری خاک خاک سی ذات پڑھ' مری شکل کے خط و خال دیکھ
کبھی اس وجود میں ڈوب کر کوئی ایک گوہر اُچھال دیکھ
کہوں کیسے قطرۂ آب ہوں' کہوں کیسے ایک احباب ہوں
کہ ازل' ابد پہ محیط ہوں' مرے شرق' غرب' شمال دیکھ
کبھی پیارے کے گھنے جنگلوں سے گزرتے دریا کے گیت سن
کبھی سبزہ زاروں میں جھومتی ہوئی تتلیوں کا جمال دیکھ
یہ جو تیرا حسن شباب ہے' یہ تو بس نظر کا سراب ہے
مجھے روکتا ہے یہاں تو پھر کسی اور طرز کا جال دیکھ
نہیں شعر حالی و میر سا' نہیں لفظ غالب و ذوق سے
پہ مری غزل کی یہ نغمگی' مرا سوز' اوجِ خیال دیکھ

مجھے کوئی الحال بس اتنی سی سزا دے پیارے
میرا مالک تجھے ان سب کی جزا دے پیارے
میں بھی انساں ہوں مجھے بھی تو بھلے لگتے ہیں
میرے آنگن میں بھی دو پھول کھلا دے پیارے
میں پسِ پردہ عنایات سے اُکتا گیا ہوں
کچھ بھی دینا ہے اگر سامنے آ دے پیارے
اب نہ لوں گا کوئی بخشش کبھی ایسی ویسی
زیست رکھ پاس مجھے موت تھما دے پیارے
دل کی دھڑکن سے نکلتا ہی نہیں غم فرہاد
کس طرح رہتے ہیں خوش لوگ بتا دے پیارے

غم نے مری نگاہ کو کیسے عجب ہنر دیے
خواب ترے وصال کے ہجر کے نام کر دیے
شاخچۂ خیال پر پھول اِدھر اُدھر کھلے
موسمِ نارسائی نے زخم جدھر جدھر دیے
میں نے کہا بجھا نہ دے تیری یہ بے رُخی مجھے
اُس نے جلا کے رکھ دیے کتنے ہی بام پر دیے
میں نے کہا کہ پھول ہو پھول سی بات کیجیو
اس نے لبوں کے سُرخ پات میرے لبوں پہ دھر دیے
اب تری کہکشاؤں کی کوئی طلب نہیں مجھے
دامنِ دل میں وقت نے اشک ہزار بھر دیے
میں تو ہر ایک موڑ پر خود سے بچھڑ بچھڑ گیا
اپنی ہی ذات نے مجھے کیسے عجب سفر دیے
پھر بھی سدا نہ رہ سکا کوئی چمن ہرا بھرا
گرچہ بہار کے لئے پھولوں نے کتنے سر دیے

یہاں کہیں بھی نہ خیمہ کوئی لگاؤ مرا
سفر میں موت ہے میرے لئے پڑاؤ مرا
سمندروں کی طلب میں رواں دواں ہوں مگر
مجھے ہی غرق نہ کر دے کہیں بہاؤ مرا
میں جس میں اپنی حقیقت کے رنگ دیکھ سکوں
کبھی وہ آئینہ لا کے مجھے دکھاؤ مرا
کسی چراغ کی لو کب اُجال پائی اسے
تم آؤ اپنی نظر سے دیا جلاؤ مرا
خبر نہیں کہ مجھے کس طرف کو جانا ہے
یہ آب و خاک ہیں میرے' نہ یہ بہاؤ مرا
یہ تُو ہے یا ہے کوئی اور اے خدائے جمال
تری طرف ہی زیادہ ہے کیوں جھکاؤ مرا
میں جس کا ہوں مجھے پہچانتا ہے وہ فرہاد
نہ میری ذات پہ کتبہ کوئی سجاؤ مرا

ہر آن میری آنکھ میں بس یہ ہی شک بھرا
تیری شبیہ سے ہے یہ قصرِ فلک بھرا
دشتِ تحیرات میں یہ سوچتے رہے
حیرت بھری نگاہ میں کس نے نمک بھرا
ہو جاتا کھل کے اس پہ اگر تیرا انعکاس
رہتا نہ آئینہ مرا اس طور شک بھرا
میں ہوں کہ میں نہیں ہوں' اسی مخمصے میں ہوں
ہونا' نہ ہونا اپنا ہی لگتا ہے شک بھرا
اک عمر آنسوؤں سے یہ آنکھیں بھری رہیں
تب جا کے کچھ ستاروں سے میرا فلک بھرا
فرہاد تشنگی مری بیدار تب ہوئی
دریا جب اُس کے حُسن کا آنکھوں تلک بھرا

محمد بشیر رانجھا/راولپنڈی

تمام بزم کو باندھا ہوا بیان میں تھا
طلسم ہوش رُبا یار کی زبان میں تھا

تمام بزم کو باندھا ہوا بیان میں تھا
طلسم ہوش رُبا یار کی زبان میں تھا
کدورتوں کا سبب مجھ سے یوں نہ تھا تیرا
ضرور تیسرا کوئی ترے گمان میں تھا
تمام عمر تجھے سوچتا رہا ہوں میں
تُو اک سوال تھا اور میرے امتحان میں تھا
چلا تو مجھ پہ کُھلا کٹ گیا جگر میرا
وہ ایک تیر کہ مخفی تری کمان میں تھا
تری نظر نہ پڑی اور بات ہے، لیکن
مرا وجود بھی حاضر ترے جہان میں تھا
بجا ہے میؔر کے دیوان بھی غضب کے تھے
مگر جو لطف مرے یار کی اُٹھان میں تھا
ہوا کی چاپ سنائی نہ دی مجھے رانجھا
میں ایسے حبس بھرے شہر بے امان میں تھا

O

چشمۂ چشم کو اس طور اُبلتے دیکھا
ہم نے شعلوں پہ بھی شبنم کو مچلتے دیکھا
عشق وہ روگ ہے جس کا بھی مقدر ٹھہرا
زندگی بھر نہ اُسے ہم نے سنبھلتے دیکھا
زندگی کیا ہے فقط ایک کہانی تو ہے
اس کہانی کو کہانی میں بدلتے دیکھا
عشق دریا کے شناور نہ کبھی گھبرائے
بارہا وقت کو رفتار بدلتے دیکھا
وہ جبیں ہے کہ شعاعوں کا ہے مرکز رانجھا
یوں رخِ یار سے سورج کو نکلتے دیکھا

میرے جنوں کو عہدِ رواں سے لڑا دیا
تہذیب کے سفر نے خسارہ تھما دیا
سُونے مکاں میں پال رہا ہوں اُداسیاں
دل سے ترے خیال کا بُت بھی گرا دیا
بھر بھر کے اشک چاہِ ذقن میں حبیب نے
محفل کو آج رات قیامت بنا دیا
محفل میں آ گئے تھے خِرد کے پیامبر
اُس کج ادا نے پل میں دِوانہ بنا دیا
صرصر نے میرے ساتھ نہ اچھا کیا سلوک
روزن میں اک چراغ تھا وہ بھی بجھا دیا
میں نے رہِ حیات کے نقشے پہ غم لکھا
یاروں نے مل ملا کے فسانہ بنا دیا

O

لب پہ اک مدعا اُٹھائے ہوئے
ہم بھی آئے ہیں من کُلائے ہوئے
روشنی کے لئے یہاں عشاق
آگ دامن کو ہیں لگائے ہوئے
آنکھ میں اشک دل میں غم تیرا
حال کیا ہیں یہ ہم بنائے ہوئے
اپنا آنگن اُجالنے کے لئے
دوسروں کے ہو گھر جلائے ہوئے
پیڑ کا حال جاننے کے لیے
کچھ پرندے ہیں پاس آئے ہوئے
زندگی ہم کو بھول بیٹھی ہے
ہم نہیں زندگی بھلائے ہوئے
قافلے بے ثمر پلٹ آئے
گھر ہائے وفا لٹائے ہوئے

خواب یوں دیدۂ بے خواب پہ رکھ آیا ہوں
دل کہ جیسے کسی گرداب پہ رکھ کر آیا ہوں
مجھ کو معلوم نہیں حال مرا کیا ہو گا؟
خواہشیں اطلس و کمخواب پہ رکھ آیا ہوں
ایسے چھوڑا ہے تیرا شہر ندامت میں نے
سارے الزام ہی احباب پہ رکھ آیا ہوں
دل رہینِ غم و آلام تھا لیکن میں اُسے
خواہشِ گوہرِ نایاب پہ رکھ آیا ہوں
میرے گاؤں میں اُجالا جو نظر آتا ہے
عکسِ مہتاب کوئیں تالاب پہ رکھ آیا ہوں
میری بستی تو اجاڑی ہے ہوا نے رانجھا
میں یہ الزام بھی سیلاب پہ رکھ آیا ہوں

O

زندگی! تیری محبت کی نشانی تو رہے
ایک قطرہ ہی سہی آنکھ میں پانی تو رہے
بس یہی سوچ کے ہر شے کو سنبھالا میں نے
اس نئے گھر میں کوئی چیز پرانی تو رہے
جذبۂ دل کے مقابل نہ کہیں رُک جائیں
بس مرے خون کی لہروں میں روانی تو رہے
تلخیاں عہدِ گزشتہ کی بھلادوں! لیکن
یاد کوئی میرے پہلو میں سہانی تو رہے
زندگی! تیری جبیں پر میں اسے لکھ جاؤں
میں رہوں یا نہ رہوں میری کہانی تو رہے

# ادریس لاہوری / ناروے

اُس کو دیکھا بھی نہیں ہے ہم نے — جس کو بھولا بھی نہیں ہے ہم نے

ادریس لاہوری کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ اُن کے والدین ہجرت کر کے لاہور آگئے۔ اور لاہور ہی اُن کی جنم بھومی ہے۔ انہوں نے بی ایس سی گورنمنٹ کالج اور الیکٹریکل انجینئرنگ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سے کی۔ واپڈا میں بطور ایس ڈی او ملازم ہوئے جلد ہی ملازمت سے اُکتا گئے اور ناروے میں مقیم ہو گئے ابتداء سے ہی شعروادب سے وابستہ ہیں۔ ناروے کی معروف ادبی تنظیم دریچہ کے جنرل سیکرٹری ہیں اس تنظیم کے تحت یادگار تقاریب کا انعقاد کیا۔ اُن کی چند غزلیں پیشِ خدمت ہیں۔ (ارژنگ)

اُس کو دیکھا بھی نہیں ہے ہم نے
جس کو بھولا بھی نہیں ہے ہم نے
جان 'جان پیار جسے کرتے ہیں
اُس کو کہنا بھی نہیں ہے ہم نے
دل میں جو آن بسا ہے اپنے
دیکھا بھالا بھی نہیں ہے ہم نے
دل کو جو شخص بہت بھایا ہے
اُس سے پوچھا بھی نہیں ہے ہم نے
سارے سچ اُس سے چھپا کر رکھے
جھوٹ بولا بھی نہیں ہے ہم نے
راستہ ساتھ لیے پھرتے ہیں
لوٹ جانا بھی نہیں ہے ہم نے
ہم نے ادریس محبت کی ہے
دکھ مانا بھی نہیں ہے ہم نے

---

جو اپنی سوچ سے اُونچا کھڑا ہے
وہی خود کو خدا سا سوچتا ہے
ردائے دھوپ اوڑھے چل رہا ہوں
مرا سایہ تو میرے زیرِ پا ہے
ستارے توڑنے نکلا تھا گھر سے
جو دیکھا چاند ہی ٹوٹا پڑا ہے

---

ہمیشہ ایک سے رہنے لگے ہیں
یہ دل کے موسموں کو کیا ہوا ہے
اُداسی ڈھانپ کر جس کو کھڑی ہے
وہیں ٹکڑا مرے دل کا پڑا ہے
بدن سے رُوح جانا چاہتی ہے
یہ خستہ حال جو گرنے لگا ہے

---

زمانہ سے گلہ ادریس کیسا ہے
جو بھگتا سارا ہی اپنا کیا ہے
خوش ادا نے جو خوش کلام کیا
جام اُلفت اُسی کے نام کیا
حُسنِ خوباں نے کھینچے سینوں کو
آج شمشیر بے نیام کیا
اُس نے دیکھا مکان خالی ہے
آ کے دل میں مرے قیام کیا
اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر نشہ
ہم نے پینے کا اہتمام کیا
عشق میں ڈوب کر محبت کو
زندگی بخش کے دوام کیا
دل پرندہ سا اُڑتا دیکھا تو
پھینک کے جال زیرِ دام کیا
ہم نے تو پیار کرنے والوں کو
دوست حد درجہ احترام کیا
ہم نے ادریس دُکھ چھپائے اور
پیار ہی پیار اُس کے نام کیا

---

پیار کا اظہار ہونا چاہیے
یہ بصد اصرار ہونا چاہیے
جاگنا اتنا ضروری تو نہیں
نیند سے بیدار ہونا چاہیے
دیکھیے دل فیصلہ تو کر چکے
اب تو بس اقرار ہونا چاہیے
آئنہ رکھتے ہو کیوں دیوار پر
یہ پسِ دیوار ہونا چاہیے
گردشِ دوراں کا یہ دورانیہ
اور کتنا یار ہونا چاہیے
کون ہے جو حاصلِ امکان ہے
یہ مرا دلدار ہونا چاہیے

---

میں جس دن سے اکیلا ہو گیا ہوں
اُسی دن سے میں اچھا ہو گیا ہوں
ملا جو آج خود سے تو یہ جانا
میں مُردہ تھا جو زندہ ہو گیا ہوں
کوئی نعمت سی نعمت تخلیہ ہے
خودی سے میں شناسا ہو گیا ہوں
مرا سایہ بھی برگد سا ہوا ہے
گھنے سے پیڑ جیسا ہو گیا ہوں
مرے احباب تھے مجھ سے گریزاں
سہولت سے اکیلا ہو گیا ہوں
مجھے ادریس اچھا لگ رہا ہے
کہ جیسا چاہتا تھا ہو گیا ہوں

# عیسیٰ بلوچ/کویت

دُور تا حدِ نظر منظر بے در دیکھوں  
چاندنی رات میں خاموش سمندر دیکھوں

دُور تا حدِ نظر منظر بے در دیکھوں  
چاندنی رات میں خاموش سمندر دیکھوں  
فرشِ ساگر پہ مچلتا ہوا چاندنی کا بھنور  
فرشِ ساگر پہ دمکتا تیرا پیکر دیکھوں  
دُور آکاش پہ بنتی ہوئی کونجوں کی قطار  
دستِ قدرت کا تراشا ہوا منظر دیکھوں  
لاکھ تاریک ہیں تاریخ کی راہیں لیکن  
اک ستارا سرِ منزل مَیں منور دیکھوں  
کون کہتا ہے کہ سورج کو زوال آئے گا  
مَیں بھی ساحل پہ کھڑا شام کا منظر دیکھوں  
وقت کے سائے میں پلتے ہوئے چہرے کیا ہیں  
تنگ و تاریک مکانوں کے مکیں گر دیکھوں  
وہ ملے یا نہ ملے اُس کی تمنا میں دل  
لٹ بھی جائے اگر سو بار لٹا کر دیکھوں  
دُھوپ اور چھاؤں کا یہ کھیل پُرانا عیسیٰ  
ختم ہو جائے گا اِک دن کہ یہ محشر دیکھوں

---

سفر پہ خوشبو نکل رہی ہے  
کلی کی رنگت بدل رہی ہے  
ہماری آنکھوں کے خواب پی کے  
یہ رات کتنی مچل رہی ہے  
کوئی نہ کوئی حسین مسرت  
تمہارے دل میں بھی پل رہی ہے  
نئے خیالوں کی حدتوں سے  
پُرانی تہذیب گل رہی ہے

خُدا کے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے  
خُدا کی دُنیا پھسل رہی ہے  
پس غزل ہے کوئی کہانی  
جو ایسے شعروں میں ڈھل رہی ہے

---

ہم بھی شاید اُن کے جیسے  
وہ بھی جیسے اپنے جیسے  
دن سے پہلے نکلیں گھر سے  
کام کی خاطر دونوں ایسے  
کچھ تو جیسے اپنے ڈر سے  
کچھ تو جیسے اُن کے ڈر سے  
بیچ کے آئیں خود کو ایسے  
اونے پونے داموں جیسے

---

میرے بدن سے جیسے ہی  
یہ دُھوپ کا جامہ اُترے گا  
مَیں آنکھیں موندے سوچوں میں  
مَیں کونے کھدرے گوشوں میں  
مَیں یاد کے اُس کے خانے سے  
مَیں دل کے خالی پنے سے  
مَیں روز کے صدمے لکھوں گا  
مَیں شاید نظمیں لکھوں گا

---

جو قتل ہو گئی سحر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
اُداس ہیں یہ بحر و بر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
اُڑا کے لے گئی ہے شب نہ جانے اُس کو کس نگر  
رہی نہ روشنی اِدھر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
جو تیرگی کے ساگرِ بسیط میں رواں دواں  
کوئی نہیں ہے بجز قمر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
تری نظر کی دین ہے جو دل مرا ہرا بھرا  
تری نظر پہ بے خبر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
یہ درد کا جہان ہے نشاطِ دل کہاں یہاں  
تو مبتلائے غم اگر' اگر تو کیا ہوا کہ بس  
وہ تیری میری آنکھ کے سوال پر سکوت سا  
وہ تیرے میرے ہونٹ پر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
جگر کے خون سے کشید ہے سحابِ غم کا رنگ  
لہو سے تر بجز نظر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
دیارِ زر پسند میں یہ بے زری کی سوچ اگر  
جو ہو گئی ہے دَر بدر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
کہاں گئے وہ ہم سفر دو چار تھے اِدھر اُدھر  
رہا ہے ساتھ مختصر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
سفر سے خوف کھا گئے نہ راستوں میں کھو گئے  
اُجڑ گئے ہیں بام و در اگر تو کیا ہوا کہ بس  
ہے شب حواریوں کا خوف نیند پر کہ ڈر گیا  
وہ یادِ خوابِ خوش نگر اگر تو کیا ہوا کہ بس  
قریں ہے منزلِ یقیں اے راہ روانِ شب گزر  
بہت کٹھن ہے گر سفر اگر تو کیا ہوا کہ بس

# ملک عرفان خانی / راولپنڈی

اُجڑے ہُوئے کھنڈرات کی تحقیق ہے لازم
انسان کے حالات کی تصدیق ہے لازم

---

اُجڑے ہُوئے کھنڈرات کی تحقیق ہے لازم
انسان کے حالات کی تصدیق ہے لازم
انسان برابر ہیں مگر تیری زمیں پر
طبقات میں کہتے ہیں کہ تفریق ہے لازم
اے دوست! حقیقت کا مجھے علم ہے لیکن
اس دورِ خرابات میں توثیق ہے لازم
شاید مری باتوں سے سنور جائے یہ گلشن
بگڑے ہوئے ماحول کی تضحیک ہے لازم
آواز یہ آتی ہے کہیں دُور سے خانی
بکھرے ہُوئے الفاظ کی تخلیق ہے لازم

---

ہر قدم پر سزا ملی مجھ کو
جرم میں نے کیا ہے کیا ایسا
زندگی گزرے گی منانے میں
ہو گیا ہے کوئی خفا ایسا
ہر کوئی ساتھ چھوڑ بیٹھا ہے
تُو مجھے چھوڑ کر گیا ایسا
میں اسے بار بار دیکھتا ہوں
لگ رہا ہے وہ یوں خدا ایسا
میں تو خود سے بچھڑ گیا عرفاںؔ
کوئی نزدیک آ گیا ایسا

---

عجب انداز سے تیرا نیا پیکر بناتا ہوں
کبھی شیشہ بناتا ہوں کبھی پتھر بناتا ہوں
سزا میں تُو نے میری انگلیاں ہی کاٹ دیں صاحب
بتا ایسا ترا میں کون سا پیکر بناتا ہوں
مجھے کچھ اس لیے بھی شوق ہے پودے لگانے کا
بلا کی دُھوپ میں چھاؤں کی اک چادر بناتا ہوں
ستارے گنتے گنتے جب بھی مجھ کو نیند آتی ہے
تھکن کو اوڑھتا ہوں گھاس کا بستر بناتا ہوں
ملک عرفان خانی اس لئے صرصر مخالف ہے
جنھیں اُڑنا نہیں آتا میں ان کے پر بناتا ہوں

---

ہُوا کیا تھا اشارہ دیکھنے کو
ملا کیا تھا نظارہ دیکھنے کو
نظر میں خاک اُڑانے کا سماں ہے
میں نکلا تھا ستارہ دیکھنے کو
مرے چاروں طرف ہے اِک سمندر
کہاں جاؤں کنارہ دیکھنے کو
منافع کی توقع ہی نہیں ہے
محبت کو خسارہ دیکھنے کو
وہ منظر تھا کیا منظر کہ خانی
ترستا ہوں دوبارہ دیکھنے کو

---

بڑھنے لگا ہے جس ہوئی ہے فنا ہُوا
تھوڑی سی آدمی کے لئے اے خدا ہُوا
پتوں سے ڈھانپ سوکھے شجر کی برہنگی
نوچے گی ورنہ جسم سے آکر قبا ہُوا
پہلے تو لوگ لے گئے چھاؤں اُتار کر
اب کر رہے ہیں پیڑ سے اُس کی جدا ہُوا
اب آؤ مانگتے ہیں خدا سے اُٹھا کے ہاتھ
تیری طلب درخت ہے، میری دُعا ہُوا
خانی کہیں قریب ہی دُشمن ہے تاک میں
نکلی ہُوئی ہے ڈھونڈنے اِک فاختہ ہُوا

---

## ”غیر نہ دسیا کوئی“

فیصل آباد کے نواح میں مقیم معروف شاعر امیر علی امیر کا مجموعہ ”غیر نہ دسیا کوئی“ حال ہی چھپ کر مارکیٹ میں آیا ہے یہ مجموعہ اُردو اور پنجابی زبانوں میں رُوحانی اور رومانی شاعری پر مشتمل ہے جن میں حمد' نعت' منقبت' سلام' نظمیں اور غزلیں قارئین کی دلچسپی کا سامان پیدا کرتی نظر آ رہی ہیں۔ اُمید ہے ادب کے شائقین کو ضرور پسند آئے گا۔ صفحات 144' قیمت درج نہیں' لگتا ہے یہ کتاب تحفۃً دینے کا ارادہ ہے۔ درج ذیل پتہ رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

نُوروالوں کا ڈیرہ پاک' امین پور روڈ'
نُوروالا بنگلہ نتھو چک 59 ج ب فیصل آباد

---

اب سفر بھی ہے مشغلہ ایسا
دے دیا اس نے راستہ ایسا

زمانے! کون سی جانب سے بام و در بناتا ہوں
گلی ہی بند ہو جاتی ہے جس میں گھر بناتا ہوں

# رفیق کاشمیری/اوکاڑا

خود پرستی کی شبیہ تھی انتہا کہنا پڑا
اور اک سیلِ رواں کو ناخدا کہنا پڑا
وہ تو موجد بھی تھا جس کا ایک دن ایسا ہوا
عشق کے ردِ عمل سے ماورا کہنا پڑا
دل گواہی کیسے دیتا آنکھ ہی ضامن نہ تھی
ارمغانِ دوستی کو سانحہ کہنا پڑا
وہ سمندر تو نہیں تھا پھر بھی جانے کس طرح
بے کراں اتنا ہوا کہ منتہا کہنا پڑا
وہ خدا ہوتا اگر تو میرا ہوتا تھا ضرور
یہ تو کوئی اور تھا جس کو خدا کہنا پڑا
کیا کہوں اُس کے تسلط سے ابھی نکلا نہ تھا
پھر ہوا ایسے کہ اُس کو الوداع کہنا پڑا
رفتہ رفتہ کس طرح یہ معاملہ طے پا گیا
جس کو دیکھا بھی نہیں تھا آشنا کہنا پڑا
وہ حسین تھا اِسقدر اِس کے سوا چارا نہ تھا
بے طرح شعروں پہ اُس کے مرحبا کہنا پڑا
آنکھ کو کیا عذر تھا پانی میں جی لیتی مگر
دل پہ کیا گذری جو اُس کو بے وفا کہنا پڑا
اپنی اَن دیکھی عقیدت کے ضمن میں کیا کہوں
قابلِ تقطیع نہیں تھی کربلا کہنا پڑا
یہ اچانک ہی ہوا سب کچھ مگر ہونا نہ تھا
پھر اُسی اندھی گلی کو راستہ کہنا پڑا
تلملایا تو بہت تھا یاد ہے مجھ کو رفیقؔ
پھر مقدر کا اُسے ہی فیصلہ کہنا پڑا

---

وہ شخص مرے دل سے برطرف نہیں ہوتا
ہر ایک کی قسمت میں یہ ظرف نہیں ہوتا
کہنا اُسے ہرجائی یہ غیر مناسب ہے
بے سمت اگرچہ ہے ہر طرف نہیں ہوتا
اک لمحہ فراموشی کا تیری میں مجرم ہوں
اوسان کی کلفت پہ تو حرف نہیں ہوتا
پروانہ ہی جلتا ہے شمع کی عقیدت میں
انوار کی دُنیا کو یہ شرف نہیں ہوتا
اُتریں تو محبت کا پاتال نہیں ملتا
سوچیں تو احاطے کو اک حرف نہیں ہوتا
سانسیں ابھی اُکھڑی ہیں انہیں ڈوب بھی جانے دو
کچھ دیر ٹھہرنے پہ کچھ صرف نہیں ہوتا
کچھ اور وجہ ہوگی اُس حسنِ جولا کی
چھونے سے کبھی شعلہ تو برف نہیں ہوتا
آنکھوں کے بیانوں پر ہی سب فیصلے ہوتے ہیں
مژگاں کی عدالت میں تو حلف نہیں ہوتا

---

مجھ کو تقدیر کا ہر فیصلہ منظور نہیں
میں کوئی حرفِ معلق نہیں منصور نہیں
میں جو آدم ہوں تو آدم کی طرح جینے دو
میں فرشتہ نہیں اُس کی طرح مجبور نہیں

---

زندگی تیری عطا ہے تو نہ جانے کیوں ہے
گر یہ میری ہے تو میرے لئے مقدور نہیں
اُس نے بے لوث اگر مجھ سے محبت کی ہے
میری فطرت میں دغا دینے کا دستور نہیں
عدل کرنا ہے تو مٹی کا لبادہ اوڑھو
ہاتھ میں لوح و قلم ہے ترے ساطور نہیں
وہ ہی اک شخص بھلا ناں تو سمجھ لینا ہے
اِن شرائط پہ مجھے زندگی منظور نہیں

---

تعلقات کو اُن سے بحال کیا کرتے
سراپا زخم تھے تو اندمال کیا کرتے
بدل بدل کے کئی زاویوں سے دیکھا تھا
وہ لاجواب تھا اُس سے سوال کیا کرتے
تمام روشنی اُس شخص کے وجود میں تھی
تو جا کے ذر پہ ترے ہم ہلال کیا کرتے
کبھی پرندے زمیں کے ستم رسیدہ تھے
فلک کے برق و شرر پر ملال کیا کرتے
کبھی ملے بھی نہیں ہم سے آشنا بھی نہیں
تو نامہ برسے ترے ہم مقال کیا کرتے
یہ فرض کر تو لیا تھا رفیقؔ کو اپنا
تو اِس سے بڑھ کے بھلا ہم کمال کیا کرتے

# کرم علی کیفی / پاک پتن شریف

نخن تصویر تک پہنچا ہُوا ہے
یہ نشہ دُور تک پھیلا ہُوا ہے
پڑھیں گے آنے والے لوگ اِس کو
پسِ دیوار جو لکھا ہُوا ہے
چھاؤں بانٹے گا شجر ایک دن
ہمارے خون سے سینچا ہُوا ہے
زرہ پیغام ہاتھ آیا نہ میرے
اگرچہ بارہا بھیجا ہُوا ہے
دلِ گمراہ کا قصہ نہ چھیڑو
کسی اپنے کا بہکایا ہُوا ہے
میں اُس آواز کو پہچانتا ہوں
اُسے میں نے کہیں سُنا ہُوا ہے
ملا ہے کیا تمھیں چاہت میں کیفی
تمہارا چہرہ کیوں نکھرا ہُوا ہے

---

اُس کا رنج و ملال اچھا تھا
دل کے کاسے میں مال اچھا تھا
اپنی قسمت میں دوریاں لکھ دیں
ربط رکھتا بحال اچھا تھا
اُس نے خوشیوں سے مر ہی جانا تھا
دل میں غم کا اُبال اچھا تھا
اُس کو نفرت سے سخت نفرت تھی
اُس میں یہ ہی کمال اچھا تھا
اُن کو دیکھا ہے بے وفا اکثر
جن کا حُسن و جمال اچھا تھا
تم نے مل کے بچھڑ ہی جانا تھا
یہ نہ ہوتا ملال ، اچھا تھا
چلتی رنجشیں محبتیں کیفی
لوگ دیتے مثال ، اچھا تھا

---

کیسے لیتے بلائیں امن کی
مر گئیں فاختائیں امن کی
اب تو دُنیا ہی ساری بہری ہے
کون سُنتا صدائیں امن کی
ہر سو ظلمت کی جب فصلیں ہوں
کیسے چلتیں ہوائیں امن کی
بات کرتے ہیں جب بزرگوں سے
وہ کہانی سُنائیں ، امن کی
تُم نے پھر بھی جلا کے رکھی ہیں
لاکھ شمعیں بجھائیں ، امن کی
میری مانو تو آج سارے ہی
مل کے بانٹیں ردائیں ، امن کی
عین ممکن خدا ، عطا کر دے
آؤ مانگیں دُعائیں امن کی
کیفی مل کے جہاں میں رہنا ہے
بات تُم کو بتائیں امن کی

---

وہ دُنیا میں دیکھا کہ کم ہوتا ہے
وہ بولے تو لفظوں سے غم ہوتا ہے
جو سچ کا پجاری ہے اُس کا لہو تو
سَر دار بھی تو بہم ہوتا ہے
بھلا جیت کس کا مقدر بنے گی
یہ ہاتھوں میں تھاما علم بولتا ہے
یہ کب ہے ضروری کہ سب کو بتاؤں
ستم گر جو تیرا ستم بولتا ہے
تبھی تو یہ بے دار ہوتے نہیں ہیں
کہ شعروں میں میرے صنم بولتا ہے
یہ اہلِ قلم کی روایت رہی ہے
خموشی میں اِن کا قلم بولتا ہے
وگرنہ تو حرفوں میں کچھ بھی نہیں ہے
یہ کیفی خدا کا کرم بولتا ہے

---

مجبور و بے زُباں ہے دُودِ دیارِ دل
احساس کا زیاں ہے دُودِ دیارِ دل
آتش زدہ بدن سے نکلا جو سسکیوں میں
اُس درد کا نشاں ہے دُودِ دیارِ دل
جل کر کیا جہاں میں خود دار عاشقوں پر
شمع کا ترجماں ہے دُودِ دیارِ دل
سمجھے گا کوئی اِس کو پروانہ حقیقت
ہمت کی داستاں ہے دُودِ دیارِ دل
شعلے نے بجھتے بجھتے جھونکے سے کہہ دیا ہے
حسرت کا کارواں ہے دُودِ دیارِ دل
اِک آن میں خلا کا ہم رنگ ہو گیا ہے
کتنا یہ ناتواں ہے دُودِ دیارِ دل
شامِ فراق کیفی ، کوئی نہیں سہارا
شاید کہ بدگماں ہے دُودِ دیارِ دل

۱- اپنے بچپن اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیں۔

ج: میرا بچپن ہندوستان میں مشرقی پنجاب کی ایک آزاد مسلم ریاست مالیر کوٹلہ ضلع سنگرور میں گزرا۔ ابتدائی تین جماعتیں بھی وہیں پڑھیں۔ اپنے بچوں کی یادوں اور باتوں پر مشتمل اپنی آپ بیتی کا پہلا حصہ انشاء اللہ نئے سال 2016ء میں ترتیب دوں گا۔ اس کا نام ہوگا۔ شکستہ داستاں (ریاست مالیر کوٹلہ کی یادیں)

۲- احمد ندیم قاسمی صاحب سے محبت اور عقیدت کی کوئی خاص وجہ؟

ج: وہ ایک اچھے شاعر' افسانہ نگار' دانشور ہونے ساتھ ساتھ ایک بڑے انسان بھی تھے۔ بڑے کردار اور ...... مالک تھے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے پندرہ بیس سال ان کی قربت اور محبت میں گزارے وہ میرے مُرشد تھے۔ اپنی کتابوں کے بارے میں ان سے کبھی کبھار اصلاح لے لیا کرتا تھا۔ میری کامیابیوں میں ان کی دُعاؤں کا بڑا اثر ہے۔ میری خوش بختی ہے جن کی قربت مجھے ان کی آخری سانس تک میسر رہی۔ ان کے ساتھ یادوں کی ایک طویل داستان ہے۔ جو کتابی صورت میں بہت جلد سامنے آئی گی۔

۳- قبرستانوں پر تحقیق کا خیال کیسے آیا......؟

ج: نامور مشاہیر کی قبروں پر لگے مدھم کتبے اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے اور کچھ بڑے بڑے ناموں والی بڑی بے نام قبروں کو محفوظ کرنے کی سوچ کو بھی عملی جامہ پہنایا اور اس کام کو چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور کام کر کے دکھایا اور دلی تسکین پائی۔

۴- مستقبل میں کیا تحقیقی کام کر رہے ہیں؟

ج: میرا ارادہ اب پورے پاکستان کی سرزمین میں آسودہ خاک خوب صورت چہروں کی تحقیق پر ہے۔ انشاء اللہ نئے سال سے صوبہ سرحد کے قبرستانوں پر تحقیق کا پروگرام ہے۔ پھر اس کے بعد صوبہ بلوچستان کا رخ کروں گا۔ یہی میرا شوق' یہی میری جستجو اور یہی میری دلی خواہش ہے۔ اب ان قبرستانوں کی تحقیق ہی میری پہچان ہے۔

۵- آپ یہ تحقیقی کام کیوں کرتے ہیں؟

ج: اس کام کی آج بھی اور کل بھی اہم ضرورت تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ تحقیق میں جستجو کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس میں جدت کی نئی نئی پرتیں ...... چلی جاتی ہیں۔ نئی اور پرانی قبریں تلاش کر کے ان پر لکھنا۔ اس کو دلی سکون ملتا رہے۔ یہی میری منزل اور یہی میری خوش نصیبی ہے۔

۶- ادب میں پسندیدہ شخصیات کون سی ہیں اور کن ادیبوں سے متاثر ہیں؟

ج: سب سے زیادہ جناب احمد ندیم قاسمی صاحب ہیں۔ جن کے قریب طویل عرصہ رہنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد منیر نیازی' احمد فراز' گلزار' استاد دامن' حبیب جالب جناب عطاء الحق قاسمی' اصغر ندیم سید' امجد اسلام امجد' اے حمید' حمید اختر' عبداللہ ملک۔

۷- تحقیقی کام سے آپ کو محکمہ پولیس کی طرف سے سہولیات ہیں مشکلات......؟

ج: میرے محکمہ کے کچھ پولیس افسران نے میرے کام کو سراہا۔ بس خالی تعریف کی حد تک۔ میرے آفس کے دوست احباب اور کچھ سینئر نے تو درخواست سے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ جن کی حوصلہ افزائی سے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جن میں جناب سخاوت علی۔ جناب غلام محی الدین' حق محمد خان' رانا محمد افضل' معظم علی' ملک محمد مسعود ہیں البتہ ایک دو شخصیات نے مجھے ذہنی ٹارچر کیا۔ پریشان کئے رکھا۔ اور بہت سی رکاوٹیں پیدا کیں۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ جو اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کسی کتاب میں بیان کریں گے۔

۸- آپ کو تمغہ حسن کارکردگی ملا تو؟

ج: اس موقع پر مجھے اپنی والدہ اور بڑی بہن بہت یاد آئیں۔ خوشی کے مارے میرے آنسو بہہ نکلے تھے۔ میری کامیابیوں میں میرے والدین کی دُعائیں' اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی' دوست احباب کا تعاون

شامل حال رہا۔ میری کامیابیوں میں میرے بڑے بھائی عمر فیصل (الفیصل) پبلیشرز کا بڑا ہاتھ رہا۔ رہی بات اس سرکاری اعزاز کے ملنے کی، میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میں تو اپنا خاموشی سے کام کرتا چلا جا رہا تھا۔ یہ عنایت تو جناب عطاء الحق قاسمی کی ہے کہ انہوں نے حکومت پنجاب کو میرا نام بھجوایا۔ کیونکہ وہ میرے کام کو ایک عرصہ سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظریں بڑی تیز تھیں اور میرا کام حالانکہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ خیر! میں حکومت پاکستان اور جناب عطاء الحق قاسمی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ ان کی عمر، رزق اور عزت میں اضافہ کرے۔ جنہوں نے میری عزت و توقیر میں اضافہ کیا۔

۹- اب تک کتنی کتب منظر عام پر آ چکی ہیں....؟

ج: آٹھ کتابیں۔

کتابیات..... ایم آر شاہد

۱- لاہور میں مدفون مشاہیر.....جلد اوّل

لاہور کے 105 قبرستانوں پر تحقیق اور ان میں مدفون شخصیات کے حالات زندگی مع تصاویر اشاعت اپریل 2003ء، صفحات 511 اور قیمت 350 روپے۔ الفیصل ناشران و تاجران۔ غزنی سٹریٹ اُردو بازار۔ لاہور۔

۲- شہر خموشاں کے مکیں

اسلام آباد، راولپنڈی (ڈویژن) کے قبرستانوں پر تحقیق اور ان میں مدفون شخصیات کے حالات زندگی مع تصاویر، اشاعت جون 2004ء، صفحات 624 اور قیمت -/300 روپے، الفیصل ناشران و تاجران۔ غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور۔

۳- شہیدان وطن

48-1947ء کے حالات و واقعات، شہدا 1965ء، 1971ء، سیاچن، کارگل، کشمیر کے حالات زندگی، اشاعت اپریل 2006ء، صفحات 476 اور قیمت -/350 روپے۔ الفیصل ناشران و تاجران، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔

۴- لاہور میں مدفون مشاہیر.....جلد دوئم

سال اشاعت جون 2008ء، صفحات 360 اور قیمت -/300 روپے، الفیصل ناشران و تاجران، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔

۵- شہدائے پنجاب پولیس

بم دھماکوں اور پولیس مقابلوں میں شہید ہونے والے پولیس افسران و اہلکاران شامل ہیں۔ سال اشاعت جنوری 2011ء، صفحات 437 اور قیمت -/350 روپے۔ الفیصل ناشران و تاجران، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور۔

۶- کراچی میں مدفون مشاہیر

کراچی کے قبرستانوں کی تحقیق پر مبنی اس کتاب میں مشاہیر کے کتبوں کی تصاویر اور حالات زندگی شامل ہیں۔ سال اشاعت فروری 2012ء، صفحات 590 اور قیمت -/500 روپے۔ مقبول اکیڈمی 199، سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور۔

۷- سجدوں کی سرزمین (سفرنامہ حج)

یہ کتاب حج بیت اللہ کے سفر پر مشتمل ہے۔ اس سفرنامے میں انسانی رویوں، مشکلات، حج، فضائل حج، مسائل حج، روئیداد حج اور مناسک حج بیان کئے گئے ہیں۔ سال اشاعت ستمبر 2013ء، صفحات 160 اور قیمت -/200 روپے ہے۔ اسے کلاسیک ریگل چوک 42، دی مال، لاہور نے شائع کیا ہے۔

۸- لاہور کے اہل قلم کا تذکرہ

اس کتاب میں لاہور میں مقیم یا لاہور سے تعلق رکھنے والے اہل قلم کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ اہل قلم جو حیات ہیں مگر اشاعت کے دوران اور کچھ بعد میں وفات پا گئے ہیں۔ کتاب میں شاعر، ادیب، صحافی، نقاد، خطاط، فوٹو گرافر، فلم رائیٹر اور ڈرامہ نویس شامل ہیں۔ اس کا سال اشاعت اگست 2014ء ہے، صفحات 527، شخصیات 526 اور قیمت -/600 روپے ہے اور اسے الفیصل ناشران و تاجران کتب، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔

زیر طبع کتب۔

شہیدان وطن (جلد دوئم)، شہدائے پنجاب پولیس (جلد دوم)، مشاہیر پنجاب، نامے میرے نام (خطوط)، کتبے بولتے ہیں، تاریخ پنجاب پولیس، بزرگان دین لاہور، درختوں کی کہانی، جب زمین نے کروٹ لی (شاعری)، اُڈیک (پنجابی شاعری)، پنجاب کے اضلاع کی تاریخ، لاہور کی عمارات (تاریخ کے آئینے میں)، دریا سمندر میں اُتر گیا (احمد ندیم قاسمی)، عبداللہ ملک (فن و شخصیت)، ہمارے ہیں حسین (سلام، نوحہ، مرثیہ)، قائد تحریک خاکسار، حمید الدین احمد المشرقی (فن و فکر)، پنجاب کی قومیں اور قبیلے، شکستہ داستان (ریاست، مالیر کوٹلہ کی یادیں)، آپ بیتی (حصہ اول)۔

مرتب کتب:

نامور صحافی، دانشور، ترقی پسند مصنف عبداللہ ملک کی چھ تصانیف مرتب کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ باقی پراجیکٹ پر کام جاری ہے۔

۱- احوال عالم اور جنرل پرویز مشرف (کالموں کا مجموعہ) اشاعت اگست 2003ء، صفحات 376 اور قیمت -/220، یوپبلشرز 5- یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اُردو بازار۔ لاہور

۲- داستان خانوادہ مولانا احمد علی لاہوری، اشاعت 2005ء، صفحات 238 اور قیمت -/150، ظفر سنز، اقراء سنٹر سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔

۳- افغانستان (قدیم وجدید) اشاعت اپریل 2007ء، صفحات 610، قیمت -/450 روپے، الفصیل ناشران وتاجران، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور۔

۴- یہ لاہور ہے (روزنامہ امروز کے کالموں کا مجموعہ) اشاعت 2010ء، صفحات 210 اور قیمت -/300 روپے، دارالشعور، ٹمپل سٹریٹ، 37 مزنگ روڈ، لاہور۔

۵- ایک مُسلم کمیونسٹ کے شب وروز (آخری ڈائریوں پر مشتمل کتاب) اشاعت 2010ء، صفحات 352، قیمت -/400 روپے۔ دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

۶- جیل یاترا (جیل کی ڈائری) اشاعت 2010ء، صفحات 200 اور قیمت -/400 روپے، دارالشعور، ٹمپل سٹریٹ، 7 مزنگ روڈ، لاہور۔

۷- مذہب اور سیاست

یہ کالموں پر مشتمل ہے۔ اشاعت 2015ء، صفحات 150 اور قیمت -/400 روپے۔ سانجھ پبلی کیشنز، ٹمپل سٹریٹ، مزنگ روڈ، لاہور۔

۱۰- کیا آپ ابتک اپنے تحقیقی کام سے مطمئن ہیں؟

میں بالکل اپنے تحقیقی کام سے مطمئن ہوں۔ کیونکہ یہ تھکا دینے والا اور معلوماتی کام ہے۔ جس کے نئی نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مشاہیر کو قریب سے دیکھنے اور پڑھنے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن میرے یہ کام کا ابھی آغاز ہے۔ ابھی تو بہت سا کام باقی ہے۔ اللہ کرے کوئی ایسا کام بھی میرے ہاتھ سے سرزد ہو جاتے جو میری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

۱۱- ارژنگ کے لئے اور ارژنگ کے قارئین کے لئے کوئی پیغام......!

سچے دل سے کیا ہوا کام کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ دوست کسی بھی فیلڈ میں ہوں۔ محنت کریں اور اپنا الگ مقام بنائیں۔ خلوص نیت سے کام کریں۔ کامیابیاں...... کامرانیاں خود بخود آپ کے قدم چومتی چلی جائیں گی۔ اسی میں انسان کی عظمت ہے اور دُنیا و آخرت کی بھلائی۔ میں ارژنگ کی پوری ٹیم کو اتنا خوبصورت میگزین نکالنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے اور اس کی پوری حُسن وعشق سے بھری ٹیم کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی سے ہمکنار کرے (آمین)۔ آخر میں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

بدن میں جب کبھی میرے ہوئی بہتات سجدوں کی
ترے قدموں پہ لے آیا میں پھر برسات سجدوں کی
وہ پھر کل رات آیا تھا مرے خوابوں کی مسجد میں
سو پھر کل اس نے آنکھوں پہ اُتاری رات سجدوں کی
ریاکاری کی کالک جن جبینوں نے سجائی ہو
بتاؤ ان کے ماتھوں پر ہے کیا اوقات سجدوں کی؟
یہ کیسا دُور لکھا ہے بشر کے بخت میں مولا
کہیں ہیں رو دُعائیں تو کہیں ہے مات سجدوں کی
محبت میں تجھے کچھ اور شاید دے نہ پاؤں میں
مگر رکھی ہے تیرے واسطے سوغات سجدوں کی
کبھی اترو ہماری رُوح میں، دل میں، بدن میں بھی
تو تب جانو کہ مرکز ہے ہماری ذات سجدوں کی
خداؤں کا ہجوم بے کراں کل پھر مرے در پہ
جبیں سے مانگنے آیا تھا کچھ خیرات سجدوں کی

مظہر الحق

## محمد اصغر مغل ☆ کے نام

ترے رنگوں سے اک تازہ جہاں آباد ہوتا ہے
ترے ہاتھوں سے تازہ زاویے تخلیق ہوتے ہیں
سمندر، چرخ، جھیلیں اور پُرانوار منظر بھی
ترے وجدان سے یوں پھوٹتے ہیں، جس طرح کوئی
کبھی گہرے خیالِ یار میں نغمہ سُناتا ہے
کسی مضراب پہ گیتوں کے سرگم کو بہاتا ہے
تری سوچوں کا ہر اک زاویہ انمول ہوتا ہے
یوں رنگوں کو سموتا ہے
نئے شاہکار بنتے ہیں، گلوں کے ہار بنتے ہیں
تمہارے پورٹریٹ اصغر!
جہاں بھی جگمگاتے ہیں، یہ خالق کی ثناء کے نقش
ہر دل پر بناتے ہیں
ترے رنگوں کے موسم
دُور تک منظر سجاتے ہیں......!

محمد امین انجم

☆ نامور خطاط۔ آرٹسٹ (اوکاڑہ)

## غزل

دیے کو بجھانے کی ضد کر رہا ہے
ستم وہ یہ ڈھانے کی ضد کر رہا ہے
مرے ساتھ آنے کو تھا جو نہ راضی
مرے ساتھ جانے کی ضد کر رہا ہے
جو خود بے خبر ہے جو خود سو رہا ہے
سبھی کو جگانے کی ضد کر رہا ہے
نیا ہے زمانہ نئی سوچ میری
وہ رسمیں نبھانے کی ضد کر رہا ہے
جو کہتا تھا کشکول کو توڑ دیں گے
وہ کام اُٹھانے کی ضد کر رہا ہے
جسے کل منایا لہو دے کہ اپنا
وہ پھر رُوٹھ جانے کی ضد کر رہا ہے
اُسے یاد آنے لگا پھر سے امجد
جو ملنے ملانے کی ضد کر رہا ہے

امجد شریف/گوجرانوالہ

## غزل

رواجوں سے کھلا انحراف کرتا ہوا
گزر گیا میں عدو کو معاف کرتا ہوا
کبھی کبھار تخیر میں ڈوب جاتا ہوں
میں آئینے پہ جمی گرد صاف کرتا ہوا
عجب نہیں کہ وہ ایک روز آپ مر جائے
فنا کی سازشیں میرے خلاف کرتا ہوا
کہ بے خودی میں تو پایا گیا ہوں میں اکثر
حریم دل میں کہیں اعتکاف کرتا ہوا
نجانے کون سی منزل پہ آ گیا اصغر
کسی کے رُخ کا مسلسل طواف کرتا ہوا

اسامہ اصغر/واہ کینٹ

## غزل

مناظر جتنے بھی مجھ کو نظر آئیں بہت ہیں
اکیلی جان ہے لیکن تمنائیں بہت ہیں
کہانی کا ہے پھیلاؤ سمٹنا جس کا مشکل
ورق کم ہیں مگر لکھنے کی آشائیں بہت ہیں
کوئی بھی شور ہنگامہ گھروں میں کم نہیں ہے
یہاں رونے کی خاطر بہنیں اور مائیں بہت ہیں
گل و گل زار سے تم کو شکایت کس طرح ہو
گلے پڑنے کو اس قریے کی مالائیں بہت ہیں
ہماری آنکھ جب ہو پھر کہاں کی خشک سالی
کہ اس کے پاس برسانے کو برکھائیں بہت ہیں
قلم کاغذ لیے بیٹھے ہیں ثاقب والہانہ
متن جتنے بھی ہم کو آپ لکھوائیں بہت ہیں

آصف ثاقب/ایبٹ آباد

## غزل

تُو کیا گیا کہ دل کو سہارا نہیں رہا
تیرے بغیر کوئی ہمارا نہیں رہا
میں نے جسے تھا پیار کی منزل سمجھ لیا
وہ کہہ رہا ہے میں بھی تمہارا نہیں رہا
جو تجھ پہ بن گیا تھا بھروسہ اُسی طرح
وہ اعتبار مجھ کو دوبارہ نہیں رہا
منزل کی جستجو میں سفر ہم نے طے کیا
منزل پہ آ کے دیکھا کنارا نہیں رہا
ہر اک علاج نقش غم دل کا کر لیا
تیرے بغیر کوئی بھی چارہ نہیں رہا

پروین نقش

## غزل

زمیں نہیں ہے، زماں نہیں ہے
یقیں نہیں ہے، گماں نہیں ہے
کہاں تری جستجو نہیں ہے
کہاں ترا آستاں نہیں ہے
ہے ایک تکرار خیر و شر میں
عجیب و یراں نگر ہے جس کی
زمیں تو ہے، آسماں نہیں ہے
غریب، محروم، غمزدہ کو
کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے
وہ جن کے دیکھے تھے خواب ہم نے
وہ روز و شب وہ جہاں نہیں ہے
ہزار رستے ہیں، فاصلے ہیں
نشان منزل رساں نہیں ہے
کبھی تو جاوید صبح ہو گی
ابھی تو کچھ مہرباں نہیں ہے

پروفیسر جاوید عباس جاوید/بھکر

## میں خدا کا عکس مٹانے لگا ہوں

خدا بہت بڑا ہے
اور آنکھیں بہت چھوٹی ہیں
ذہن بہت تاریک ہیں
الجھن زیادہ ہونے لگی ہے
تصویر دھند میں غائب ہو رہی ہے
بینائیاں چھن رہی ہیں
میں شفا کے لیے
کینوس پر سے
خدا کا عکس مٹانے لگا ہوں
میں محبت کی تصویر بنانے لگا ہوں

پشتون احمد زائی/وزیرستان

## غزل

ہم زمیں ٹھہرے اور وہ آفاق
خوب ہے یہ بھی زندگی کا مذاق
خوش نما خوش جمال لمحوں کے
شامِ غم نے پلٹ دیے اوراق
آج بھی اس کے پیار کی باتیں
میرے صبر و سکوں کی ہیں قزاق
رابطے ختم کر دیے اس نے
آج یہ قرض بھی ہوا بیباق
اس کو پانے کی آرزو میں ہمیں
سہتے رہنا ہے عمر بھر کا فراق
ایسے لوگوں کا ساتھ ہے جن کے
مسکراہٹ لبوں پہ دل میں نفاق
راستے ہو گئے جدا تسنیم
بھول جاؤ وفاؤں کا میثاق

تسنیم کوثر/لاہور

## غزل

زمیں تو زمیں آسماں مانگتا ہے
سرِ تخت، خونِ کساں مانگتا ہے
پرو کر غریبوں کو نوکِ سناں پر
بتا اور کیا امتحاں مانگتا ہے؟
چلے ہیں جو سوئے فلک راستوں پر
مرا ہم سفر کہکشاں مانگتا ہے
بھٹکنے کو دشتِ گماں میں بہر سو
نئی رہگزر کارواں مانگتا ہے
سرابوں میں بھی جی کے دیکھا مگر دل
گماں پہ نیا اک گماں مانگتا ہے
خموشی سے تھک ہار کر ظلم کہنے
مرا نطق بھی اک زباں مانگتا ہے
تمنائیں یہ نیم جاں دیکھ کر بھی
سرِ دشت موجِ رواں مانگتا ہے
خراجِ ستم بس یہی ایک اس کا
کہ لوگوں سے آہ و فغاں مانگتا ہے

حمزہ ہاشمی سوزؔ/لاہور

## غزل

کیا لطف ہے یارانِ سخن دربدری میں
کچھ روز گزاریں اس آشفتہ سری میں
اے میرے نئے زخم معانی کہ ذرا میں
اُلجھا ہوں گزشتہ کی ابھی بخیہ گری میں
میں خاک درِ کلبۂ احزاں ہوں ازل سے
اور اُس کا مقابل کوئی خشکی نہ تری میں
ہو جاتا گھڑی بھر کے لئے اُس کا مقابل
اک شخص بھی ایسا نہ تھا یارانِ جری میں
منزل پہ پہنچنے کی تمنا ہی نہیں ہے
وہ لطف اُٹھائے ہیں تری ہم سفری میں
وہ جون کی بارش کی طرح آتی ہے خالدؔ
گرمی ہے کہ لگتا ہے کہ بیٹھا ہوں مری میں

خالد شریف

## غزل

ہوا کی سوگواری میں چھپی استھائیاں ہیں
برا کمرہ ہے میں ہوں اور بری تنہائیاں ہیں
اسی مٹی سے جنمی ہیں جو میری اصل بھی ہے
یہ فصلیں ایسا لگتا ہے مری ماں جائیاں ہیں
ذرا سا چاند دیکھا اور مد و جزر جاری
سمندر میں دلوں جیسی کہاں گہرائیاں ہیں
وہی لَے جس سے آواز جدائی آ رہی ہے
اسی کی دوسری جانب مدھر شہنائیاں ہیں
کھڑی بولی میں اُس نے بات کی ہے آج مجھ سے
پھر ایسے میں حسنؔ رضوی کی یاداں آئیاں ہیں
مجھے خالدؔ اکیلے پن سے خوف آتا نہیں اب
کہ میرے ساتھ مدت سے مری رسوائیاں ہیں

خالد شریف/لاہور

## غزل

ہم ترے پیار کے سانچے میں بھی ڈھل سکتے ہیں
اور کل اپنا ارادہ بھی بدل سکتے ہیں
ہم سفر تجھ سا اگر ہم کو میسر آئے
ہم زمانے سے بہت دُور نکل سکتے ہیں
جن کے کردار چراغوں سے مشابہ ہوں گے
مثلِ سورج وہی مشرق سے نکل سکتے ہیں
اے غزالوں کی تمنا میں بھٹکنے والے
آستینوں میں تری سانپ بھی پل سکتے ہیں

یہ بھی ممکن ہے مقدر ہمیں رستہ ہی نہ دے
اے مرے عشق ترے ساتھ بھی چل سکتے ہیں
ان ستاروں کا سفر ہے تو فقط اتنا ہے
شرق سے اُبھرے ہوئے غرب میں ڈھل سکتے ہیں
اپنے دامن میں اگر خوشیوں کی خیرات نہیں
ایسی صورت میں تو پھر ہاتھ ہی مل سکتے ہیں
تیرے کردار میں جس درجہ تمازت ہوگی
تیرے دشمن بھی اُسی درجہ پگھل سکتے ہیں
وہ محبت کی کہانی کی شروعات کرے
پھر فسانے بھی حقیقت میں بدل سکتے ہیں
دیکھ لازم ہے رویوں میں توازن ورنہ
اپنے اعمال پہ ہم ہاتھ بھی مل سکتے ہیں
تیرے جیسوں کو محبت کا ہنر آ جائے
پھر تو تقدیر کے پانسے بھی بدل سکتے ہیں
اے مرے یار تری نیم نگاہی کے سبب
ذائقے زیست کے تلخی میں بدل سکتے ہیں
ہم وہ بدبخت کہ بچپن میں بڑھاپا دیکھا
ہم وہ بوڑھے کہ کھلونوں سے بہل سکتے ہیں

ٹھوکریں کھا کے اگر لوگ سنبھل سکتے ہیں
پھر مصیبت کے یہ لمحات بھی ٹل سکتے ہیں
جن کی مٹھی میں محبت کا کوئی جگنو ہو
وہ سیہ غار سے چپ چاپ نکل سکتے ہیں
میرے محبوب تری پھول سی صورت کے لئے
ماہ و خورشید کے ارمان مچل سکتے ہیں
یہ جو مٹی کے کھلونے سے پڑے رہتے ہیں
وقت آنے پہ تری سمت بھی چل سکتے ہیں
اے مرے یار ترے آنکھ بدل جانے سے
ذائقے زیست کے تلخی میں بدل سکتے ہیں
یہ بھی ممکن ہے جُدائی ہو گوارا تیری
اور ملاقات کو ارمان مچل سکتے ہیں
گر بصیرت کا چلن عام یہاں ہو جائے
کھوٹے سکے کہاں آرام سے چل سکتے ہیں
جن کے جذبوں میں ہو منزل پہ پہنچنے کی تڑپ
وہ ہر اک گام پہ گر کر بھی سنبھل سکتے ہیں
جو محبت کو کریں عام زمانے بھر میں
سر اُٹھا کے تری دُنیا میں وہ چل سکتے ہیں
وہ جو تقدیر بدلنے کا ارادہ کر لیں
زائچے بھی وہ محبت کے بدل سکتے ہیں
اے مرے یار ترے آنکھ بدل جانے سے
ذائقے زیست کے تلخی میں بدل سکتے ہیں
وہ جو چاہیں' تو بیک جنبشِ ابرو سے نبیلؔ
میری تقدیر کا عنوان بدل سکتے ہیں

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل/ لاہور

زندگی کہنے کو ہے لمحات کی چادر کا نام
اور سرور زندگی سوغات کی چادر کا نام
پھول کچھ نایاب سے کھلنے لگیں گے دیکھنا
ابرِ رحمت بھی تو ہے برسات کی چادر کا نام
دل سے نکلا وصل کی شب کے بسر ہونے کے بعد
لطف پرور ہو گیا ہے رات کی چادر کا نام
نکتہ آرائی کی باتوں کو الگ کر دیجئے
شاعری تو ہے فقط جذبات کی چادر کا نام
حالِ دل سُن کر ہنسی میں تم اُڑا کر چل دیئے
اور فسانہ رکھ دیا ہے بات کی چادر کا نام
تیرے در سے درد کی خیرات لے کر آ گیا
یہ بھی سب کچھ ہے مرے حالات کی چادر کا نام
میں نے بے خبری میں رکھا تھا تخلص جو ندیمؔ
اب وہی ٹھہرا ہے میری ذات کی چادر کا نام

ریاض ندیم نیازی/ سبی

## غزل

جو بات دل کو لگے' کاش لب پہ آ جائے
شعور زیست میں رازِ ابد سما جائے
ستم ظریفیوں کی اُس کے کوئی حد ہے کہ جو
ہمارا ہوتے ہوئے گھر ہمارا ڈھا جائے
عجیب کام یہ پکڑا ہے باڑ نے اکثر
بنام حفظ و اماں کھیت کو جو کھا جائے

وفور حبس کے سارے کُھلی فضا چاہیں
سفید اودھر در زنداں ' یہیں رہا جائے
شدید کرب کا باعث ہے ایسی رُسوائی
انائے ذات کو' جو سر کو بھی جھکا جائے
ہمیں تو کوئی میسّر ہو ناخدا ایسا
سفینے کو لبِ ساحل ہی جو دکھا جائے
زمینِ دل خس و خاشاک سے اَٹی ہے مگر
ضمیر شعلہ کی خواہش اسے جلا جائے
ریاضؔ کیسا وہ کیف آفریں نظارہ ہو
صدائے دل کو غور سے سنا جائے

سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال

## "غلام"

میں شعور اور لاشعور
کی جنگ میں
مدتوں سے مبتلا ہوں
مگر لاحاصل
نہ کوئی نتیجہ خیز عمل
نہ کوئی بامعانی کردار
نہ کوئی اسم بامسمّٰی
نہ کوئی لرزہ خیز سوچ
میرے چار سو
پتھر کے انسان
حیواں سے بدتر
فکر کے آقا
جنہیں سورت الزلزلہ (زلزلہ)
کا خواب بھی نہیں
میں شعور اور لاشعور کی
جنگ میں مدتوں سے
مبتلا ہوں

شکیل امجد صادق/اوکاڑہ

## غزل

کھو گیا ذات کی گپھاؤں میں
وہ جو شامل تھا سب خطاؤں میں
سانس لینا محال کر دے گی
وقت کی گرد ہے فضاؤں میں
کیسے پاؤ گے میرے نقشِ قدم
پاؤں رکھتی ہوں میں ہواؤں میں
ہار ہونا ہی تھا سماعت پر
شور برپا ہے بے نواؤں میں
کوئی کومل سا استعارہ ہے
اُس کی بے انتہا اداؤں میں
آج وہ آزما رہا ہے مجھے
کل جو تھا طالع آزماؤں میں
بھیجتا اپنے نام کا سورج
گھر گئی میری شب بلاؤں میں
اُس کے آنے سے درد ڈھلتا ہے
وہ بھی شامل ہے اب دواؤں میں
صائمہ جان کر ہوئی حیران
دل بھی ہوتا ہے دیوتاؤں میں

صائمہ اسحاق/کراچی

## غزل

ظلم کرنا ہے روایت آج کی
کھا رہا ہے آدمی کو آدمی
ظلمتوں نے سَر نکالا اس طرح
خوف سے گھبرا گئی ہے روشنی
کوئی بھی پرسانِ غم اپنا نہیں
کس قدر تنہا ہے اپنی زندگی
دوستوں کو چھوڑنا منجدھار میں
ہے یہی دُنیا میں رسمِ دوستی
چاند کی کرنوں پہ کیسا اختیار!
یہ پرائی کل بھی تھیں اور آج بھی
اس کو کہتے ہیں نصیبوں کا عروج؟
ہو گئے ہم اپنے گھر میں اجنبی
کیا ہوا' کیوں توڑ دی ہے اے ظہیر
پتھروں نے آئینوں سے دوستی

ظہیر احمد ظہیر/لاہور

## غزل

تیری سمت دھیان گیا
دل میرا قربان گیا
جھوٹ بھی تیرا سچ ہے پیارے
میں تو بس یہ جان گیا

# شاعری (بلحاظ حروف تہجی)

پیار کی بستی ایسی اُجڑی
دل بھی ہو حیران گیا
اپنا گھر ہے ویران ' ویراں
جب سے وہ مہمان گیا
اُس کی یادیں دل کی دُشمن
جینے کا امکان گیا
اُس نے کر کے رہنا ہے
دل میں جو وہ ٹھان گیا
جب سے پریت لگائی اُس سے
شافی ہر ارمان گیا

عقیل شافی/لاہور

## غزل

کیا تھا دل نے جو دل سے قرار' ٹوٹا ہے
کہ اب کی بار' عجب اعتبار' ٹوٹا ہے
عجیب دورِ جنوں ہے پتہ چلا ہی نہیں
کب اور کیسے انا کا حصار ٹوٹا ہے
تمہاری مشقِ ستم ہی سے دل بھی زندہ ہے
دھڑک رہا ہے اگرچہ' ہزار ٹوٹا ہے
سکوتِ شب میں یہ کیسی صدائے درد اٹھی
یہ کس کی آنکھ سے شبنم کا ہار ٹوٹا ہے
ستارہ آخرِ شب ہی سہی' بلاؤ اُسے
تمہیں خبر ہے کہاں سے شمار ٹوٹا ہے
جو شعر ہم نے کہے تھے سُروں میں ڈھل نہ سکے
بھرا تھا درد ہی اتنا' ستار ٹوٹا ہے
میں جانتی ہوں وہ اب کے سنبھل نہ پائے گا
وہ زندگی میں امر پہلی بار ٹوٹا ہے

عرفانہ امر/گوجرانوالہ

## صبا سرشت تتلیو!

صبا سرشت تتلیاں
اگر کہیں رکیں تو ان سے پوچھنا
قیام بھی ہے راہ میں؟
کوئی چراگاہ ہیں؟
سفر وسیلۂ ظفر ہوا تمہیں؟
بہار کی ہوا نے بھی چھوا تمہیں؟
سفر بہت طویل ہے
سفر نصیب تتلیو!
کسی کو ساتھ لے لیا؟
رہے گا ہم رکاب دل؟
یہ رُوپ رنگ ساتھ بھی نبھائے گا
فریب تو نہ دیں گی
دھڑکنوں سے بات ہو گی؟
صبا سرشت تتلیو!
سفر بہت طویل تھا
مجھے تو مات ہو گئی

عبیرہ احمد

## غزل

آج شہر میں میرے رت بڑی سہانی ہے
پاس میرے آؤ تم بات اک بتانی ہے
کل تمہارا چہرہ تھا' دوست میری آنکھوں میں
آج میری آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی ہے
میں ہوں بالکونی میں "راجہ گدھ" کا ناول ہے
اور میری سوچوں میں عشق کی کہانی ہے
رنگا رنگ پھولوں کی بیل اک باقی ہے
بیل میرے گھر میں ہے بیل یہ پرانی ہے
دور اک راجہ کی دور ایک رانی کی
داستاں پرانی ہے جو میری زبانی ہے
خواب کوئی ٹوٹے تو پھر کہاں وہ جڑتا ہے
نیند سے تمہاری اب' نیند بھی ملانی ہے
میں نے تو محبت کی' بات کی تھیں اُس سے
بات پھر قمرا اُس نے' یاد کیوں دلانی ہے

قمر ریاض/(مسقط)

## غزل

وہ تختیاں قلم دوات کیا ہوئے
رہے جو بچپنے میں ہاتھ کیا ہوئے؟
وہ جن کو چھوتے ہی چمک اُٹھی تھی سانس
وہ خوشبوؤں سے تیرے ہاتھ کیا ہوئے؟
ندی کنارے سارے پیڑ کٹ گئے
جو ڈھونڈے تھے سوکھے پات کیا ہوئے؟
میں پھر نہ دیکھ پایا اُن کو صبح دم
میرے ادھورے سپنے رات کیا ہوئے؟
میں جیت کر کسے گلے لگاؤں گا
جو دے رہے تھے مجھ مات کیا ہوئے؟

# شاعری (بہ لحاظ حروف تہجی)

جو عشق راستوں کی دُھول ہو گئے
وہ لوگ جو تھے عشق ذات کیا ہوئے؟
کہاں گئے؟ جو آس پاس تھے قمر!
جو کر رہے تھے مجھ سے بات کیا ہوئے؟

قمر ریاض/ (مسقط)

## غزل

اُداسی' بے سکونی' شامِ ہجراں' پھیلتے سائے
وہ کیفیت رہی اپنی کسی سے کہہ نہیں پائے
مسائل اپنے لے جاؤ کسی درویش کے آگے
نہ ہم ہیں صاحبِ دانش' نہ ہم صاحب رائے
یہ بستی ہوگئی ہے اب تو اُس کے خون کی پیاسی
اُسے کہہ دو کہ اس بستی سے وہ فوراً نکل جائے
اچانک پاؤں اُس کا آ لگا ہے پاؤں سے میرے
خدایا اب نہ وہ تادیر اپنا پاؤں سرکائے
سنہرے دور کی یادوں کا حصّہ ہیں' اثاثہ ہیں
کچھ جو گیت ہم نے مل کے باہم پیار میں گائے
ہماری ہی نظر اب مستند ہے' قولِ فصل سی
اُسے ہے زعم جس فن پر' ہمارے سامنے لائے
اُسی لہجے کی وقعت ہے' اُسی فن کی ضرورت ہے
کہ جو نظروں کو چکائے کہ جو سینوں کو گرمائے
کیا شکوہ' یہ ہم سے اُس نے اپنے شہر میں راشد
یہاں آ کر حرامی گھر پہ ملنے کیوں نہیں آئے

ممتاز راشد/ لاہوری

## غزل

سلونی شام کی جھوٹی کہانی بیچ آتے ہیں
کسی سے وصل کی نیلی نشانی بیچ آتے ہیں
اسی پونجی سے شاید آخری دن چین سے گزریں
جوانی کی یہ ساری رایگانی بیچ آتے ہیں
زبانوں کی نئی تشکیل کی حد سے ذرا پہلے
پرانے لفظ اور ان کے معانی بیچ آتے ہیں
ابھی بازار ہے' مل جائیں گے کچھ دام بھی اچھے
محبت نام کی اک شے پرانی بیچ آتے ہیں
"مرے احباب مجھ سے بے تحاشا پیار کرتے ہیں
چلو' بغداد جا کر یہ کہانی بیچ آتے ہیں
وہ شہروں میں بھٹکتے رہتے ہیں پھر در بہ در ناصر
جو بستی میں بزرگوں کی نشانی بیچ آتے ہیں

ناصر علی سیّد/ پشاور

## غزل

بتائیں کیا کہ کہاں تک سفر ہے خوشبو کا
نظر کی حد ہے جہاں تک اثر ہے خوشبو کا
غمِ حیات کے کانٹے جہاں نہیں اُگتے
ہمارا دل وہ مثالی نگر ہے خوشبو کا
چلے ہیں جانبِ صحرا جو ہوش والے بھی
یقین مانیے سارا اثر ہے خوشبو کا
مہکنے لگتے ہیں پتھر بھی اُس کی قُربت میں
بدن وہ کانچ کا ایسا شجر ہے خوشبو کا
مرے بغیر اُدھورے ہیں دونوں عالم بھی
غلط نہیں ہے یہ دعویٰ اگر ہے خوشبو کا
بس ایک بار ہی گزرا وہ گلبدن لیکن
دیارِ دل سے ابھی تک گزر ہے خوشبو کا
نگاہِ بد سے بچائے خدا ہمیں شاہد
ہماری عُمر میں پہلا سفر ہے خوشبو کا

ہمایوں پرویز شاہد/ لاہور

## غزل

کون کہتا ہے تجھ پہ مرتا ہوں
میں تو رسماً سلام کرتا ہوں
بدگمانی کی اتنی پھسلن ہے
راستوں پہ سنبھل کے چلتا ہوں
کچھ تو بدلا ہے موسموں نے لباس
اور کچھ میں اُداس رہتا ہوں
دل کے جذبوں سے مصلحت کیسی
میں اُصولوں کی جنگ لڑتا ہوں
مدعا میرے دل کا ہے اتنا
اُن کے آنچل سے پیار کرتا ہوں
اُن کی آنکھوں میں ڈوب کر عثمان
ساحلوں کے لئے مچلتا ہوں

ہمایوں پرویز شاہد/ لاہور

# شاعری (بہ لحاظ حروف تہجی)

(رخشندہ نوید کے شعری مجموعہ کے حوالے سے نظم)

مجموعہ ہے
مجموعے میں
ایک جہانِ رنگ و بو ہے
شعر طلسم کدہ ہے کوئی
نظم کھلا جادو ہے
شمع پگھلتی اس دُکھ میں
شعلہ بے قابو ہے
آنکھوں میں ہے میں کی مستی
لب پر تو ہے تو ہی تو ہے
شعر دُعا ہے شعر صدا ہے
نعرۂ یاہو ہے

..........

مجموعہ ہے
مجموعہ ہے وادی جیسا
اس وادی میں
مصرعے ہیں یا بادل گھیرے
مضموں ہیں یا پھول سنہرے
امکاں ہیں یا گھاس کے میداں
سوچیں ہیں یا پن چکیاں
نظم ہے یا پگڈنڈی کوئی
یا جھیلوں کی جانب جاتی
ایک سڑک ہے ٹھنڈی کوئی
مجموعہ ہے
مجموعہ حیرت کا در ہے

ایک عجائب گھر ہے
پیار حنوط شدہ تتلی ہے
اور آئینے کے اندر ہے
چپٹے چند قدیمی سکے
کھو جانے کا ڈر ہے
اندیشہ تلوار ہے کوئی
خوف کوئی خنجر ہے
ایک غزال' غزل سے باہر
ایک غزل اندر ہے

حسن عباسی/ لاہور

## حاصل

عمر کا پچھلا پہر ہے اب تو
ٹوٹ کے چاہنے والے لوگ
اوڑھے اپنے کاندھوں پر
رقص کناں ہیں
آہ و فغاں کا اک طوفان ہے
عمر کا حاصل
وحشت ہے یا چاہت کوئی
ان لمحوں نے کچھ حرفوں کو
عمر کے حاصل کر ڈالا ہے
ہم کو پاگل کر ڈالا ہے

آسناتھ کنول/ لاہور

## پیارے خدا! تم کہاں ہو؟

اُس سات سالہ وزیرستانی بچے کی آنکھیں
آج بھی میرا تعاقب کرتی ہیں
جو رات کے پچھلے پہر
لالٹین ہاتھوں میں اُٹھائے
مسجد کی ساتھ والی گلی میں
خدا کو ڈھونڈ رہا تھا
"پیارے خدا
تم کہاں ہوں؟
میرے بابا تو کہتے تھے
کہ جب وہ تمہارے نام پہ لڑتے لڑتے
شہید ہو جائیں گے
تو آپ اُسے جنت لے جائیں گے
بابا دو پہر سے چارپائی پر پڑے
آپ کے منتظر ہیں
آپ کیوں نہیں آتے؟
میرے بابا کو جنت کیوں نہیں لے جاتے؟
میرے
پیارے خدا؟"

پشتون احمدزئی/ وزیرستان

# انتخاب اشعار

افتخار اشعر/لاہور

کہانی میں کوئی رد و بدل کر
مرا مرنا ابھی بنتا نہیں ہے
افضل خان

اپنے ہونٹوں سے ادا کر کے میں زندہ ہو جاؤں
لفظ ہوں اور معنی کے لئے آیا ہوں
فرناس سیّد

اس کی مٹھی میں گرفتار ہیں ہم ریت کی مثل
رکتے رکتے بھی روانی سے نکل آئیں گے
اظہر فراغ

میری نیندوں سے لڑ پڑی دُنیا
اس کو خوابوں میں دیکھتا تھا میں
شہزاد نیّر

ناکام عشق ہوں سو مرا دیکھنا بھی دیکھ
کم دیکھتا ہوں اور غضب دیکھتا ہوں میں
شاہین عباس

سُورج کی طرح روز نکلتا ہے وہ گھر سے
اب شہر کی گلیوں سے اُجالے نہیں جاتے
علی رضا

شرط اتنی ہے کہ بارش کی طرح آنا تم
دیکھنا کیسے میں شاخوں سے نکل آؤں گا
حسن عباسی

قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اُتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں
اعجاز توکل

مرے پروں پہ ہے لکھا ہوا کسی کا نام
میں جب اڑوں گا تو پھیلیں گی شہرتیں اُس کی
افتخار اشعر

کہانی پھیل رہی ہے اُسی کے چاروں طرف
نکالنا تھا جسے داستاں کے اندر سے
ثناءاللہ ظہیر

جا بہ جا میں نے درختوں پہ ترا نام لکھا
میں نے جنگل میں کیا ہے تیرا چرچا میرے دوست
مشتاق احمد

مجھے اب احتیاطاً خط نہ لکھنا
مرے بیٹے کو پڑھنا آ گیا ہے
نصرت صدیقی

ہم جنہیں لوٹ کر نہیں آنا
کیا ہمیں دیکھنا نہ چاہو گے
سیّد امتیاز احمد

بدلہ نہ میرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تیری محفلوں میں ہوں
احمد فراز

کسی خیال، کسی وسوسے میں کھوئی ہوئی
وہ آج پھر نظر آئی تھی روئی روئی ہوئی
اختر عثمان

اتنے پیارے اور حسیں ہو جتنا سوچا جا سکتا ہے
لیکن سوچنے کی بھی حد ہے کتنا سوچا جا سکتا ہے
سعید عاصم

تمہارے نام کی خوشبو بسی ہے
مرے ہونٹوں کو تتلی چومتی ہے
سلیم کورمانی

کوئی خطرہ نہیں دُشمن سے ہمیں
ہم تو ہوتے ہیں نشانہ اپنا
نازاوکاڑی

## بقیہ ...... قمر رضا

یہ وہ زمانہ تھا جب میرے آبائی شہر کبیروالہ میں اُستاد شاعر بیدل حیدری، خادم رزمی، وفا حجازی اور نور اسماعیل جیسے بڑے نام قیام پذیر تھے۔ بیدل حیدری اور وفا حجازی کے مابین معاصرانہ چپقلش اپنے عروج پر تھی۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے خلاف باقاعدہ ہجو یہ کلام تحریر کیا جاتا تھا۔ بیدل حیدری کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جبکہ وفا حجازی شعروں پر اصلاح نہیں دیتے تھے۔ بیدل صاحب نے پاکستان بننے کے بعد انڈیا سے ہجرت کر کے لاہور کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں سے ۵۶ کی دھائی میں کبیروالہ آئے جبکہ وفا حجازی قیام پاکستان کے فوراً بعد امرتسر سے ہجرت کر کے کبیروالہ آباد ہوئے۔ بظاہر ان دونوں کی معاصرانہ چپقلش سے ادبی ماحول میں ایک کشیدگی تھی مگر اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ کبیروالہ جنوبی پنجاب میں ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ دونوں شاعر ایک دوسرے کے مقابلے میں ایک ہی دن مشاعرے منعقد کرتے تھے اور بیرون شہر سے اپنے اپنے شاعر دوستوں کو بلاتے تھے۔ کبیروالہ کے ادب ذوق افراد کو ہر دو شاعر اپنی طرف کھینچتے تھے اور یوں یہاں کے عام شہریوں میں بھی ادب کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔ دوسرے شہروں سے بیدل حیدری کے تلامذہ کی آمد بھی یہاں کے ادبی ماحول میں گہما گہمی پیدا رکھتی تھی۔ اس گہما گہمی کے نتیجے میں تخلیق شعر کے لیے ایک مسابقت کی فضا قائم ہوئی۔ بیدل حیدری کے باقاعدہ شاگردوں میں ارشاد جالندھری، اختر شمار، شکیل سروش، ناصر بشیر اور مظہر بخاری وہ اہم نام ہیں جو آج بھی ادبی میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ جب کہ ایسے بھی بہت سے شاعر ادبی منظر پر موجود ہیں جو بیدل حیدری کے باقاعدہ شاگرد تو نہیں تھے مگر جنہوں نے بیدل حیدری کی تنگ دستی سے فائدہ اُٹھایا اور شاعری میں نام کمایا ان پردہ نشینوں کا تذکرہ پھر کسی وقت کے لیے چھوڑتا ہوں۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو محکمہ شماریات میں ایک ملازمت مل گئی جس کی بدولت تقریباً ۲ سال لیہ قیام پذیر رہا۔ لیہ اگرچہ ادبی مراکز سے دور دراز جنوبی پنجاب کا ایک نسبتاً پسماندہ ضلع تھا لیکن یہاں کے ادبی ماحول میں ڈاکٹر خیال امروہوی، نسیم لیہ، غافل کرنالی اور شہباز نقوی جیسے اہم شاعر تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ نسیم لیہ ایک مجلسی آدمی تھے۔ وہ لیہ کی میونسپل لائبریری میں لائبریرین تھے۔ اُن کی لائبریری تو خیر ادبی محافل کا مرکز تھی ہی مگر ہر شام وہ صابر ہوٹل پر بھی ادبی محفل جماتے۔ تمام احباب جمع ہونا شروع ہو جاتے اور رات گئے تک یہ نشست جاری رہتی۔ وقتاً فوقتاً اُردو اور سرائیکی مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا۔ جس میں گردونواح کے شاعر بھی شریک ہوتے تھے۔ اس حوالے سے یہ خطہ کافی فعال تھا۔ میرے لیے یہ ماحول بہت سازگار تھا۔ یہاں میں نے سرائیکی زبان میں بھی شاعری شروع کی۔ یہاں سے ساہیوال ٹرانسفر ہوا تو ایک مختلف ادبی ماحول میرے سامنے تھا۔ یہ مالی طور پر آسودہ ادیبوں اور شاعروں کا شہر تھا۔ اُن دنوں جعفر شیرازی، گوہر ہوشیار پوری، حاجی بشیر احمد بشیر، اکرم خان قمر اور محمود علی محمود جیسے تخلیق کار یہاں موجود تھے۔ سٹیڈیم ہوٹل اور اکرم کلیم کے ہوٹل سیر دان میں ادباء اور شعراء جمع ہوتے تھے۔ جعفر شیرازی مرحوم کے پاکستان بھر کے ادیبوں اور شاعروں سے رابطے تھے۔ وہ یہاں کی مقامی انتظامیہ سے مل کر کل پاکستان مشاعروں کا انعقاد بھی کرتے۔ ایسے ہی کسی مشاعرے میں پہلی مرتبہ ظفر اقبال نے میری غزلیں سنیں تو انہوں نے مجھے گلے لگا لیا اور بعد ازاں میری شاعری پر ''نئے شاعر کے ظہور'' کے عنوان سے ایک تفصیلی کالم تحریر کیا اور یہ کسی بڑے شاعر کی طرف سے شاید میری شاعری کا پہلا باقاعدہ اعتراف تھا۔

ساہیوال آیا تو پھر لاہور جیسے بڑے ادبی مرکز سے میرا رابطہ ہوگیا۔ وہاں علی اکبر عباس نے میری شاعری سنی تو پی ٹی وی کے بڑے مشاعروں میں شرکت کا موقع مل گیا۔ لاہور میں اُن دنوں جن ہم عمر شاعروں سے میری دوستی ہوئی اور حلقہ قائم ہوا اُن میں ڈاکٹر جاوید انور، عباس تابش، علی اصغر عباس، اعجاز نقوی، زاہد مسعود، افضال نوید، ضیاء الحسن جیسے احباب تھے۔ فنون کا دفتر ٹھکانہ ہوا۔ وہاں مجھے احمد ندیم قاسمی کی شفقتیں اور محبتیں حاصل ہوئیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ آج میں جو کچھ ہوں وہ جناب احمد ندیم

قاسمی کے سبب ہوں۔ انہوں نے مجھے مسلسل فنون میں شائع کیا۔ جس کی بدولت مجھے ملک بھر کے ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔

سوال: ادبی سفر میں مشکلات۔

جواب: دیکھیں جی کسی بھی نئے شاعر کو اپنے ادبی سفر کے آغاز میں سب سے بڑی مشکل جو پیش آتی ہے وہ بطور شاعر اپنی حیثیت کو منوانا۔ کیونکہ اگر وہ اچھا شاعر ہے تو اُس پر پہلا الزام ہی یہ عائد کیا جاتا ہے کہ یہ شاعر نہیں ہے بلکہ کسی استاد شاعر سے غزلیں لکھواتا ہے۔ یقیناً مجھے بھی یہ مشکل پیش آئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنی شاعری کے اوائل عرصہ میں اُردو اکیڈمی ملتان کے تنقیدی اجلاس میں اپنی چند غزلیں پیش کیں۔ غزلیں تو پسند کی گئیں مگر چند احباب کی طرف سے یہ آوازیں بھی سننے کو ملیں کہ یہ غزلیں کسی سے لکھوائی گئی ہیں۔ اسی طرح بہاولپور کے مشاعرے میں غزل سنائی تو بہت داد ملی۔ مشاعرے کے بعد کھانے پر ایک بزرگ نے فرمایا کہ آپ نے جو غزل سنائی تھی وہ بہت عمدہ تھی لیکن وہ غزل آپ کی نہیں ہے۔ جس پر میں نے کہا کہ آپ کے یہ الفاظ بھی میری تعریف ہیں۔ کیونکہ میں تو جانتا ہوں یہ غزل میری ہے۔ بعدازاں کی مشکلات شاید اتنی اہم نہیں ہیں۔ یعنی مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ نام مقام کا جھگڑا میڈیا پر پذیرائی نہ ہونا یہ وہ تمام معاملات ہیں جو اُس وقت مشکل بنتے ہیں جب آپ کی ترجیحات میں یہ سب کچھ شامل ہو۔ اگر آپ کی ترجیح شاعری ہے تو پھر شاید یہ کچھ بھی نہیں اور خدا کے فضل و کرم سے میرا مسئلہ صرف شاعری ہے۔ یعنی یہی خواہش کہ شاعری ہوتی رہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک مشکل ایسی بھی ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ آپ جن دوستوں کے ساتھ تخلیقی سفر کا آغاز کرتے ہیں اگر وہ کسی وجہ سے ادبی میدان میں آگے بڑھنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو بعض اوقات اُن کی فرسٹریشن، حسد اور ردعمل آپ کے لیے مسائل پیدا کرتا ہے۔ خدا ہر اچھے تخلیق کار کو اس صورت حال سے بچائے کہ وہ اپنے ہی دوستوں کا نشانہ بنے۔

سوال: آپ ادبی مراکز سے دور رہ کر مرکزی دھارے میں کیسے شامل ہوئے۔

جواب: اگر میں ادبی مراکز سے دور رہ کر ادب کے مرکزی دھارے میں ہوں تو شاید اس کی بنیادی وجہ تو میری شاعری ہی ہوسکتی ہے جو ادبی مراکز تک پہنچی تو اُس نے وہاں رہنے والے سینئر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے مسلسل مجھے فنون میں شائع کیا۔ اسی طرح انڈیا میں شمس الرحمن فاروقی نے شب خون میں میری شاعری کو جگہ دی اور آج آصف فرخی صاحب ''دنیا زاد'' میں میرا کلام بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ یہ وہ ادبی جرائد ہیں جہاں شائع ہونے کے لیے ایک خاص شعری معیار درکار ہے۔ اسی طرح امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی نے قدم قدم پر میری پذیرائی کی۔ شاکر حسین شاکر اور طاہر نسیم میرے دو ایسے ادبی دوست ہیں جن کے احسانات کا بدلہ میں کبھی چکا نہیں سکتا۔ انہوں نے ہر مقام پر عملاً میرے لیے ایسے حالات پیدا کیے جہاں بطور شاعر مجھے آسانیاں میسر آ سکیں۔ عامر بن علی اور نوید حیدر ہاشمی مجھے اپنے بڑے بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں اور کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جہاں میرے فن کو پذیرائی مل سکے۔ شعیب صادق کا پیار میرا اثاثہ ہے۔ اسی طرح رضی الدین رضی، نوازش علی ندیم، ذاکر حسین ضیائی، افضل گوہر، اختر رضا سلیمی، شکیل جاذب، ناصر علی، شاہد ذکی، کاشف مجید، احمد کامران، افضل خان، حسنین اصغر تبسم، منیر راہی، علی معین، احمد عطا اللہ، خالد مسعود اور بہت سے دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے جن کی محبتوں کے طفیل میں آج اس مقام پر ہوں۔

سوال: ادب کے فروغ میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے کیا کردار ادا کیا۔

جواب: مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ادب ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی ترجیحات میں کبھی نہیں رہا کسی زمانے میں اخبارات کے ادبی ایڈیشن کسی نہ کسی حد تک ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ مگر اب اکثر اخبارات نے ادبی صفحات ہی شائع کرنا بند کر دیے ہیں یا پھر ادب کے لیے جگہ کم کر دی ہے اور اگر الیکٹرانک میڈیا کا جائزہ لیا جائے تو وہ بھی پی ٹی وی قومی دنوں یا مذہبی تہواروں کے موقع پر مشاعروں کا اہتمام و انصرام کر دیتا ہے اور وہ بھی شعراء کی ایک مخصوص فہرست سے باہر نہیں جاتا۔ البتہ انٹرنیٹ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اُس نے فی الوقت دنیا بھر میں بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کی تشنگی کو کسی حد تک کم کر دیا ہے۔ فیس بک ایک ایسا ذریعہ ہے جہاں دُنیا بھر کی ادبی خبریں، ادیبوں اور شاعروں کی مصروفیات، تازہ ترین تخلیقات اور اُن پر ردعمل فوری طور پر سامنے آ جاتا ہے لیکن اس میں بھی ایک قباحت ہے کہ رطب

دیا بس کی بہتات ہے۔ اچھے کلام کی تلاش میں کافی سرکھپانا پڑتا ہے۔

سوال: مشاعروں کا ادب کے فروغ میں کیا کردار ہے؟

جواب: مشاعرے کبھی ہماری تہذیبی روایت کا حصہ تھے اور شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہونے والے سامعین اور کلام سنانے والے شاعر دونوں اس کے آداب سے واقف تھے۔ اچھے اشعار پر کھل کر داد دی جاتی اور کمزور اشعار پر خاموش رہا جاتا تھا۔ مگر اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ اکثر مشاعرے ادبی سے زیادہ معاشی Activity میں تبدیل ہو گئے۔ تقاضوں کے حصول کے لیے جس انداز میں منتظمین کی منتیں کی جاتی ہیں وہ انتہائی شرم ناک ہے۔ مشاعروں میں شریک ہونے کے لیے ہر طرح کا حربہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جب سے غیر ملکی مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا ہے صورت حال اور بھی افسوس ناک ہو گئی ہے۔ بہت سے ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جہاں میزبانوں نے بڑی مشکل سے مہمانوں کو اپنے گھر سے نکالا اور آئندہ کے لیے مشاعروں سے توبہ کی۔ بیرونِ ملک بہت سے باکمال شعراء بھی مقیم ہیں اور وہ وہاں عمدہ تقریبات کا اہتمام بھی کرتے ہیں مگر انہیں بھی پروفیشنل شاعروں نے تاراج کیا ہوا ہے۔ جن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر مشاعرے میں شرکت کریں خدا ہم پر رحم فرمائے۔

سوال: ہمارے ادبی ادارے ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: جہاں تک ہمارے ادبی اداروں کا تعلق ہے اکادمی ادبیات پاکستان مقتدرہ قومی زبان، مجلس ترقی ادب اور نیشنل بک فاؤنڈیشن ادب کے فروغ کے لیے اپنے وسائل میں کوشاں ہیں۔ ویسے بھی اس وقت ان اداروں کے بیشتر سربراہان کا تعلق ادب سے ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہمارا ادیب اور شاعر بھی بددیانت ہو جائے تو ادارے کیا کر سکتے ہیں۔ ادیبوں کے معاملات میں میرٹ قائم رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اُن پر اس قدر دباؤ ڈال دیا جاتا ہے کہ ناانصافی خود بخود ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر اکادمی ادبیات وقتاً فوقتاً ادیبوں اور شاعروں کو بیرون واندرون ملک دوروں کے مواقع فراہم کرے تو اثر ورسوخ رکھنے والے شاعر اور ادیب کسی کو آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ اس طرح کتابوں کی اشاعت اور کانفرنسوں میں شمولیت کا معاملہ ہو تب بھی یہ لوگ کسی نہ کسی انداز میں صاحبانِ اختیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سوال: آپ نے نظم بہت کم کہی ہے کیا آپ نظم کے خلاف ہیں؟

جواب: جی نہیں میں بالکل نظم کے خلاف نہیں ہوں۔ اصل میں یہ آپ کے مزاج پر منحصر ہے۔ آپ کہاں سہولت محسوس کرتے ہیں۔ میرے لیے شاید غزل زیادہ آسان ہے سو میں غزل کہتا ہوں۔ میں نے نظمیں بھی کہی ہیں جو خالصتاً میری ذاتی وارداتوں کی کہانیاں ہیں۔ ممکن ہے کسی وقت میں ان میں دوسرے لوگوں کو شریک بھی کرنا چاہوں۔ تو پھر ان کا بھی ایک مجموعہ شائع کردوں گا۔

## ابھی نہ جاؤ

ابھی تو کرنوں کی بارشیں ہیں
حسین رُت کی نوازشیں ہیں
سُرور و مستی کی سازشیں ہیں
ابھی نہ جاؤ ابھی نہ جاؤ

ابھی تو فرقت کے دن گئے ہیں
کڑی مصیبت کے دن گئے ہیں
بڑے ہی وحشت کے دن گئے ہیں
ابھی نہ جاؤ ابھی نہ جاؤ

ابھی تو ہم تم ملے ملے ہیں
ابھی تو غنچے کھلے کھلے ہیں
ابھی تو دامن سلے سلے ہیں
ابھی نہ جاؤ ابھی نہ جاؤ

ابھی ہمارے یقیں گماں ہیں
ابھی اندھیرے چھپے کہاں ہیں
ابھی تو سمت سحر رواں ہیں
ابھی نہ جاؤ ابھی نہ جاؤ

ابھی تو جذبے مچل رہے ہیں
ابھی تو چشمے اُبل رہے ہیں
ابھی تو ہم تم سنبھل رہے ہیں
ابھی نہ جاؤ ابھی نہ جاؤ

وہ میری سوچیں وہ میرا سپنا
نہ ہو مقدر وہی تڑپنا
ابھی چھڑاؤ نہ ہاتھ اپنا
ابھی نہ جاؤ ابھی نہ جاؤ

مجھے پتا ہے نہ رُک سکو گے
تم اپنی ضد کا بھرم رکھو گے
نہ جانے پھر کب کہاں ملو گے
ابھی نہ جاؤ ابھی نہ جاؤ

محمد وحید انصاری/ لاہور

# مختصر ادبی خبریں/تقریبات

## تعزیت

قرشی دواخانہ کے زونل منیجر (لاہور) کے پروفیسر ڈاکٹر ریسرچ حکیم اعجاز فاروقی پچھلے دنوں اچانک داغ مفارقت دے گئے۔

مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے ادارہ نستعلیق ان کی وفات کو شعبہ طب کا نقصان تصور کرتا ہے۔ ہم مرحوم کے درجات بلند ہونے کی دعا اور لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

## تعزیت

ریڈیو پاکستان لاہور کی سینئر پروڈیوسر عفت علوی کے برادر عزیز کی وفات پر ادارہ نستعلیق مرحوم کے لئے دعا گو ہے اور پسماندگان کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔

## تعزیت

گوجرانوالہ میں مقیم نوجوان شاعر اور ''نوائے ادب'' کے ایڈیٹر صدام ساگر کی ہمشیرہ پچھلے دنوں انتقال کر گئیں۔ ہماری دعا ہے اللہ (مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

## تعزیت

کوئٹہ میں معروف شاعر دانیال طریر کے پچھلے دنوں راہی عدم ہونے سے ادبی حلقہ ایک اچھے شاعر سے محروم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے

دعا گو.........ادارہ نستعلیق

## تعزیت

منڈی فیض آباد میں مقیم پنجابی زبان کے صاحب طرز شاعر الحاج حکیم نذیر احمد نذیر طویل علالت کے بعد قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ مرحوم ''اصحاب کہف'' منظوم لکھنے کے حوالے سے کافی شہرت رکھتے تھے ادارہ نستعلیق مرحوم کی بلندی درجات کی دعا کے ساتھ ان کے پسماندگان کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔

## تعزیت

نجی چینل ایف ایم 103 کے ہر دلعزیز براڈ کاسٹر افضل ساحر کی والدہ ماجدہ پچھلے دنوں انتقال کر گئیں مرحومہ کی مغفرت کے لئے ادارہ نستعلیق دعا گو ہے۔

اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(ادارہ نستعلیق)

## پریس ریلیز

ہم ممبران و عہدیداران بشمول صدر و چیئرمین اس امر پر شدید احتجاج کرتے ہیں کہ پچھلے دنوں ہمارے ہمسائے ملک بھارت میں ایک فلم بجرنگی بھائی جان ریلیز ہوئی جس میں سلمان خان پر ایک قوالی (بھر دو جھولی مری یا محمد ﷺ) فلمائی گئی جو کہ حضرت پرنم الہ آبادی کی لکھی ہوئی ہے یہ امر اور بھی زیادہ افسوسناک ہے کہ نا صرف اس میں تبدیلی کی گئی بلکہ شاعری کے بول میں بھی ردو بدل کیے گئے مذکورہ لوگ اس کے کسی صورت بھی مجاز نہ تھے کاپی رائیٹ ایکٹ کے مطابق کسی کی تحریر منظوم صنف میں از خود تبدیلی کرنا بجائے خود ایک جرم ہے۔ ہمارا یہ حق ہے کہ ہم فلم ساز، پروڈیوسر، گلوکار اور منسلک لوگوں پر ہر جانے کا دعویٰ کریں سو ہم پاکستانی سفارت خانے کے حوالے سے انڈین ہائی کمشنر سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ ہمارے یہ جذبات من وعن متعلقہ لوگوں تک پہنچائیں اور پرنم الہ آبادی کی اس قوالی کو بغیر اجازت فلم میں پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ بصورت دیگر شاعر کا باقاعدہ نام استعمال کیا جائے۔

اگر ایسا ممکن نہ ہوا تو بزم پرنم کے عہدیداران حکومت پاکستان کی وساطت سے ہر جانے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں۔

## ادبی رپورٹ

بزم غالب انٹرنیشنل اور نیشنل کالج آف آرٹس کے زیر اہتمام نعتیہ مشاعرہ ثقافتی بیٹھک سی۔ سی۔ آر۔ ایس لاہور میں منعقد کیا گیا۔ نامور شاعر توقیر احمد شریفی نے صدارت کی۔ گلزار بخاری۔ ملک سلیم اختر اور صائمہ الماس مسرور مہمانان خاص تھیں۔ نظامت کے فرائض بزم غالب انٹرنیشنل کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر ایم ابرار نے سرانجام دیئے۔ دیگر شعراء اور شاعرات میں اقبال راہی۔ عدل منہاس لہوری۔ عطاء العزیز۔ میجر (ر) خالد نصر۔ حاجی لطیف کھوکھر اور صدف زماں شامل تھے۔

☆☆☆

# تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: جو آقا کا نقش قدم دیکھتے ہیں (نعتیں)/شاعر: ریاض ندیم نیازی/صفحات 184 / قیمت: 500 روپے/فلیپ: ڈاکٹر خورشید رضوی

ناشر: ماورا پبلشرز لاہور

ریاض ندیم نیازی نے اس شعر میں کمال اعجاز کے ساتھ نعت گوئی کی اساس تعین کرتے ہوئے 'کوشش نعت کے حقیقی صلے کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ جذبے کی یہ صداقت اور غنچۂ دل کی یہ شگفتگی اس مجموعۂ نعت میں خوشبو کی طرح بسی ہوئی ہے۔

ریاض ندیم نیازی کے ہاں ریاضتِ فن بھی صاف نظر آتی ہے اور قدرتِ کلام بھی (جس کا ثبوت غالب کی زمینوں میں طبع آزمائی سے ملتا ہے)۔ نعت' ریاضت اور قدرت دونوں سے ماورا چیز سے دگر'' کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ یعنی ایک جذب والہانہ جس کے بغیر شاخ سخن کو بادِ سحر گاہی کا نم میسر نہیں آتا۔ ریاض ندیم نیازی کے دل سے پھوٹتا ہوا یہ نم قاری کی آنکھ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

کچھ ہی عرصہ ہُوا ''مطر تجلیات'' کے عنوان سے ریاض ندیم کا تیسرا نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تازہ مجموعہ ''خدایا ایں کرم بار دگر کن'' کے مصداق ہے۔ میں سعادت کے اس تسلسل پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نام کتاب: سید ریاض حسین زیدی کی نعتیہ شاعری/تحقیق وتدوین: نوید عاجز/صفحات 222 / قیمت: 450 روپے/فلیپ: خالد علیم

ناشر: الاشراق پبلی کیشنز ۲۔نور چیمبرز گنگا رام، گنپت روڈ لاہور

پروفیسر ریاض حسین زیدی مستند اور معتبر شاعر کی حیثیت سے دُنیائے ادب میں اپنا منفرد مقام حاصل کر چکے ہیں۔ غزل اور نظم میں اُن کا تخلیقی سرمایہ اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے تاہم نعتیہ شاعری اُن کے لئے سرمایۂ اعزاز ہے۔ اُن کی نعتیہ شاعری جہاں اُن کے لئے اُخروی نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے وہاں دنیوی اعزازات کی بھی حامل ہے۔ اُن کے دو مجموعہ ہائے نعت پر انہیں سیرت ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے اور یہ ایک طرح سے اُن کی تخلیقی کاوشوں کا واضح اعتراف ہے۔ اسی اعتراف کی ایک منظم و مرتب صورت نوجوان شاعر و ادیب جناب نوید احمد عاجز کا ایم فل کی ڈگری کے لئے یہ تحقیقی مقالہ ہے جو اُن کی نعتیہ شاعری کے تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ کا حاصل ہے۔

جناب نوید احمد عاجز نے اپنے اس مقالے کے دیباچے میں اظہار عجز کے طور پر اسے ایک ادنیٰ کاوش قرار دیا ہے مگر میرے نزدیک اُن کی یہ کاوش عمدہ معیار تحقیق و تجزیہ کی حامل ہے۔ اس مقالے کا ایک قابلِ قدر حصہ اُردو نعت کے پس منظر کے طور پر عربی اور فارسی نعت گوئی کا مختصر جائزہ ہے۔ جناب نوید احمد نے ممکنہ مآخذ کے حصول کے بعد نعتیہ شاعری کی روایت کو جامع اور دل نشیں انداز میں رقم کیا ہے۔ نعت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم، نعتیہ شاعری کے موضوعات اور آداب نعت گوئی پر اُن کا اندازِ نظر ایک بالغ نظر تجزیہ کار کی دلیل ہے۔ مقالے کی ابتدا میں انہوں نے پروفیسر ریاض حسین زیدی کے خاندانی پس منظر، اُن کی شاعرانہ حیثیت اور شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مقالے کا دوسرا باب نعت گوئی کی روایت کے لئے مخصوص ہے جب کہ تیسرا باب زیدی صاحب کی نعتیہ شاعری کے فکری مطالعے کے لئے وقف ہے جس سے قاری کو اُن کی نعتیہ شاعری کے تخلیقی محاسن، فکری جہات اور اندازِ نعت گوئی سے آگاہی ہوتی ہے۔ مقالے کے باب چہارم میں نوید احمد نے زیدی صاحب کی نعتیہ شاعری کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ باب تجزیہ نگاری میں مقالہ نگار کی ذہنی کاوشوں کا حاصل ہے اور اس اعتبار سے مستزاد بھی کہ انہوں نے تحقیقی و تنقیدی جائزے کی عام روش سے گریز کرتے ہوئے فنی تجزیہ نگاری کو بھی اپنے مقالے کی بنیاد بنایا ہے۔ علم بیان اور صنائع لفظی و معنوی کے آئینے میں انہوں نے زیدی صاحب کی نعتیہ شاعری کا خوب صورت جائزہ بھی پیش کیا ہے اور زبان و بیان کے حوالے سے چند ایک شعری تسامحات

پر بھی اپنے فکری وفنی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ جناب نوید احمد کا یہ تحقیقی وعلمی جائزہ قاری پر جہاں سیّد ریاض حسین زیدی کی نعت گوئی کے امتیازی اوصاف اور فنِ نعت گوئی میں ان کے مقام ومرتبہ کا تعین کرنے میں معاون ہے وہاں جناب نوید احمد کی تحقیقی وفکری تجزیہ کاری کا آئینہ دار اور اُن کی علمی ہنر مندی کا غماز ہے۔

نام کتاب: ہر دُکھ کی دوا صلی علی ﷺ / صفحات 720 / ہدیہ: درج نہیں / تبصرہ نگار: ناز اکاوڑی

---

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

---

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ سچ کہوں تو مجھے اپنی کم مائیگی کا بہت زیادہ احساس ہے کہ میں ایسی مُتبرک کتاب پر تبصرہ کرنے کا اہل کہاں۔ مجھے میری کم علمی بھی میرے سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اُس کاملِ جہاں ہستی کے بارے میں ہے جن کے بارے لکھتے ہوئے بڑے بڑے جید علماء کے بھی ہاتھ کانپ کانپ گئے۔ الشیخ عبدالجلیل بن محمد الفیر وانی التیونسی رحمتہ اللہ علیہ کی عالیشان تصنیف کو ایک عاشقِ رسول بحر العلوم اُستاد الحدیث جناب علامہ زاہد محمود قاسمی نے جس محبت رسول میں سرشار ہو کر اہلِ برصغیر اہلِ زبانِ خطہ پر احسان فرمایا ہے۔ یقیناً قابلِ ستائش ہے دُعا ہے وسیلہ بخشش بھی ہو۔ آمین!۔ مذکورہ کتاب ایک لاکھ منتخب احادیث کا مجموعہ ہونے کے ساتھ ساتھ 6019 تعداد میں دُرود شریف کی اقسام بیان کی گئی ہیں تمام تعدادی درود شریف ہر دُکھ، درد کی دوا، ہیں بحیثیت مُسلمان بعدِ خداوند کریم حضور اکرم ﷺ پر ایمان شرطِ ثانی ہے۔ جو وجۂ خلقِ جہان ہوں جو عرش وفرش کے تاجدار ہوں جو تمام مخلوق سے اعلیٰ واولیٰ ہوں جو محبوبِ خدا ہوں جس کی قسم خدا خود کھائے دُرود خود بھیجے تو ہم کیوں نہ۔ صاحبِ ایمان وبصیرت حضرات کے لئے تحفہ خاص ہے۔ ہر مُسلمان گھر کی ضرورت ہونی چاہیے۔ بچوں کی اسلامی تربیت اور حضرت محمد ﷺ سے اپنی عقیدت ومحبت سے روشناس کرانے کا ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ دُرود وسلام کے فیض وبرکات سے آگاہ اور مُستفید ہو کر اپنی عاقبت سنوارنے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ مجھے اُمید واثق ہے کہ اہلِ اسلام محبانِ رسول اکرم ﷺ کے لئے ایک عظیم تحفہ ثابت ہوگی ضخامت کے لحاظ سے 720 صفحات کی کتاب کو بیکن بُک گلگشت کالونی ملتان وغزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ہدیہ درج نہیں بلکہ عاشقانِ رسول کے لئے ہدیہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مجھے اُمید ہے یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

نام کتاب: مابعد جدیدیت / مرتب: ڈاکٹر ناصر عباس نیر / صفحات 464 قیمت: 750 روپے / فلیپ: ڈاکٹر وزیر آغا

---

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

---

مابعد جدیدیت کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی یہ دوسری مرتب کردہ کتاب ہے۔ پہلی کتاب میں انہوں نے وہ مقالات جمع کیے جن میں مابعد جدیدیت کے تعقلات کو زیر بحث لایا گیا تھا۔ زیرِ نظر کتاب میں ایسے مقالات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جن میں مقالہ نگاروں نے متن کھولنے کے لئے مابعد جدیدیت کی فکری رَو کو بروئے کار لانے کی سعی کی ہے۔ مابعد جدیدیت ایک خود رَو فکری نشاۃ الثانیہ ہے جس نے اپنے عصر کی ''روح'' کو پیش کیا ہے۔ مابعد جدیدیت حتمیت اور اصلیت کے بجائے اضافیت کی قائل ہے۔ وہ انسان اور فطرت' نیز ناظر اور منظور کی ثنویت کو قبول نہیں کرتی۔ حد بندیوں اور نظری سرحدوں کو مسترد کرنے کے ساتھ ساتھ ناقابلِ تغیر ''جوہر'' کے بجائے تغیر پذیر صورتِ حال کا اقرار کرتی ہے۔ حدیہ کہ زماں کے تسلسل کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کی جگہ وہ عدم تسلسل یعنی Discontinuity کا پرچار کرتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ ہر شے کی تعبیر میں خرابی کی صورت دکھاتی اور معنی کے مسلسل التوا کو نشان زد کرتی ہے۔ اُردو ناقدین نے جب اپنے مقالات میں مابعد جدیدیت کے مہیا کردہ اس منظر نامے کے حوالے سے متن کی کنہ میں جھانکنے کی کوشش کی ہے تو گویا مابعد جدیدیت کے تعقلات سے مدد لی ہے۔ ناصر عباس نیر قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ان مقالات کو مرتبہ کر کے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی ضرورت جامعات میں ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔

نام کتاب: ہجرتوں کے موسم میں/ شاعرہ: روبینہ راجپوت/ صفحات: 132 / قیمت: 325 روپے/ رائے: ساجد رضوری

---

ناشر: علامہ اقبال روڈ۔ چوک گڑھی شاہو۔ لاہور

---

روبینہ راجپوت ایک طویل عرصے سے شاعری کر رہی ہیں۔ ''آدھی بہار'' میں اُن کی غزلیں روایت سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں مگر نظمیں اپنا الگ اسلوب رکھتی ہیں۔ پیش نظر مجموعہ کلام ''ہجرتوں کے موسم میں'' اس مجموعے کے نام سے مناسبت رکھتی ہوئی نظمیں اس لیے اثر انگیز ہیں کہ وہ محض شاعری نہیں بلکہ مشاہدہ اور ذاتی تجربہ بھی ہے۔ شکست و ریخت میں کوتی چھوٹی چھوٹی چیزیں' ماحول کی بے ترتیبی اور ہجرتوں کے موسم میں وہ دُکھ جو لمحاتی نہیں بلکہ خون رگِ جاں میں اُتر کر سدا گردش میں رہتا ہے اُس نے الفاظ کی بے زبانی کو نطق جاں میں تبدیل کر دیا ہے۔ قاصد مرحوم کی عمیق نگاہ سے گزرنے والی روبینہ راجپوت کی شاعری منصۂ شہود پر آ کر اپنے قارئین سے سند پسندیدگی یقیناً حاصل کر چکی ہے۔ جہاں تک اُنہوں نے اپنے حوالے سے میرے لیے جس خوش کلامی سے کام لیا وہ محض نثری شاعری کا حصہ ہے۔ صاحبانِ نقد و نگاہ اُن کے کلام پر بہتر انداز سے گفت گو فرمائیں گے۔

روبینہ راجپوت نے کئی زبانوں میں شاعری کی ہے اور مسلسل کر رہی ہیں۔ وہ نو آموز نہیں تو بہت پختہ کار بھی نہیں۔ لہٰذا وہ امکانات کی اُس شاہراہ پر ہیں جہاں وہ اعتبار شاعری کے اُس سنگِ راہ کو جلد چھو لیں گی جس کی خواہش میں وہ رواں دواں ہیں۔

نام کتاب: رنگِ شہر/ شاعر: سلمٰی افتخار احمد/ صفحات 160 / قیمت: 500 روپے/ رائے: ڈاکٹر ناہید قاسمی

---

ناشر: ماورا پبلشرز لاہور

---

سلمٰی افتخار احمد مقبول استاد اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی صاحبزادی ہیں۔ وہ ایک ماہر نفسیات' انفارمیشن ٹیکنالوجی سے آگاہ' ریڈیو کی خوبصورت آواز اور لائق وکیل ہیں۔ وہ محنتی اور ذمہ دار سرکاری افسر بھی رہی ہیں۔ میں اُن کی بہت سی خوبیوں کی معترف ہوں۔ اُن کی گفتگو بہت نفیس' احساس اور سوچ میں گہرائی' وژن ہمہ جہت اور اخلاقی رویے بہترین ہیں۔ یہ سب دیکھتے ہوئے میں اُن سے ہر بار کہتی رہی کہ آپ تخلیقی وفور سے بھرپور ہیں۔ آپ کو شعر و ادب کی دُنیا بلا رہی ہے۔ آپ اس کی پکار کب سنیں گی!...... بالآخر اُن کی طرف سے مثبت جواب آ گیا اور سلمٰی نے اچھی نظمیں' پُرکشش انشائیے اور منفرد موضوعات پر متاثر کن افسانے لکھنا شروع کر دیے۔ اُن کے افسانوں میں جیتی جاگتی زندگی کے حقیقی پہلو اور اُن کے بارے میں فکر و احساس کامیابی سے اُبھرتے ہیں۔ اُن کے کئی پُر اثر افسانے اُن کی منفرد پہچان بن گئے ہیں۔ سلمٰی کے اس پہلے افسانوی مجموعے ''رنگِ شہر'' کی اشاعت پر میں بہت خوش ہوں اور اُن کی فنی انفرادیت کے نکھار کے لئے دُعا گو رہتے ہوئے' ابھی سے اُن کے اگلے مجموعے کے انتظار میں ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

نام کتاب: سفید گلاب/ شاعر: محمود ظفر اقبال ہاشمی/ صفحات 224 / قیمت: 600 روپے/ فلیپ: افتخار ساجد

---

ناشر: ماورا پبلشرز لاہور

---

'سفید گلاب' مشرقی اور مغربی روایات کے تال میل سے جنم لینے والا ایک ایسا خوبصورت اور اصلاحی ناول ہے جو باب اوّل سے آخر تک قارئین کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ ہر چند کہ ایک وسیع ترین کینوس پر پھیلی ہوئی تصویرِ کائنات کے دو مختلف اور متضاد نظریۂ زندگی کو بادی النظر میں سمیٹنا حد درجہ مشکل اور کٹھن کام ہے مگر محمود ظفر اقبال ہاشمی نے سہل زبان' خوبصورت الفاظ اور منظر کشی کی جذبات انگیز سحر کاری سے اسے اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ ناول کے قارئین خود کو ہر منظر کا

ایک حصہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ مصنف قاری کا بازو پکڑے اسے اپنے ساتھ ساتھ لئے چل رہا ہو۔ کہیں بھی مصنوعی پن یا غیر ضروری لفاظی کا احساس نہیں ہوتا۔ فہد اور میری (مریم سلمان) کے کردار ہمارے ہی معاشرے کے دو زندہ جاوید کردار محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں رومان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ حقائق کی گرہ کشائی کا عمل بھی نظر آتا ہے لیکن انتہائی مہارت اور پرکاری کے ساتھ۔ ہر چند کہ ناول نگاری کی حیثیت سے محمود ظفر اقبال ہاشمی کی یہ پہلی کاوش ہے لیکن ان کی مہارت فن اور موضوع پر مضبوط گرفت دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یقیناً اس فنکار نے قلم پر یہ دسترس یونہی حاصل نہیں کر لی بلکہ اس کے پیچھے برسوں کی ریاضت فن شامل ہے۔ بلاشبہ ''سفید گلاب'' کئی جہتوں اور معنوں میں بے حد خوبصورت' دل پذیر اور زندہ رہنے والی کہانی ہے۔ جو لوگ سفرناموں کی یک رنگی تحریروں سے اُکتا چکے ہوں انہیں یہ ناول ضرور پڑھنا چاہیے جس میں باہر کے شہروں کا ہی نہیں' دلوں' ذہنوں اور اندر کے شہروں کا احوال بھی تفصیل سے موجود ہے!

نام کتاب: اپنے مُوں ڈرلگدا/ شاعر: بیاء جی/ صفحات 150 / قیمت: 500 روپے/ فلیپ: شعیب بن عزیز

---

ناشر: القریش پبلی کیشنز' سرکلر روڈ چوک' اُردو بازار لاہور

---

ہر تخلیقی فنکار روانگوں بیاء جی نوں اپنے فن دے ذریعے حیرانی کھلارن تے حیرت زدہ کرن دا ہنر آوندا اے' گھر چہ پہلوں میں الحمراء آرٹ گیلری وچ بیاء جی دے آرٹ ورک دے نمونیاں دی نمائش ویکھی تے بوہت حیران ہویا ایہ ای نہیں سگوں او ہناں دے فن پاریاں وچ حیاتی دے سارے رنگ تے چانن پورے آب نال موجود سن' بیاء جی نے اپنے فن نوں چار چن لان لئی کینوس تے بُرش دی تھاویں نرے رنگاں والے دھاگیاں نوں فنکارانہ تے تخلیقی انگ وچ ورت کے نچ ڈھنگ نال کم لیا اے' تے جدوں میں بیاء جی نوں پنجابی شاعری دی دُنیا وچ بیٹھ اُتے کامیابیاں حاصل کر دیاں ویکھیا تے میریاں حیرانیاں دی کوئی حد نہ رہی' شاعری دے جہان وچ نواں پیر رکھن والی بیاء جی کویں اینی تیزی نال تے تھوڑے جیہے ویلے وچ اپنے فن دا سکہ منوالیا اے' میرے کول تے ایہناں سوالاں دا جواب کوئی نہیں' جے تہاڈے کول ہے تے مینوں ضرور دسیا جے۔

نام کتاب: پانچواں موسم/ مصنف: صائمہ کامران/ صفحات 158 / قیمت: 500 روپے/ فلیپ: امجد اسلام امجد

---

ناشر: ماورا پبلشرز' لاہور

---

پروین شاکر کی وفات کے بعد سے اب تک اُس کے پائے کی کوئی شاعرہ تو سامنے نہیں آئی مگر چند ایسے نام ضرور اُبھرے ہیں جن سے کم یا زیادہ توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ صائمہ کامران کا شمار اسی فہرست میں ہوتا ہے۔ اُس کی شاعری کا سب سے قابلِ توجہ پہلو اُس جذباتی شدت اور چنچل پن کا تسلسل ہے جس میں ایک الہڑ لڑکی اور ایک حساس عورت بیک وقت اپنا اظہار کرتے ہیں۔ اُس کی بے باکی میں ایک خاص نوع کی معصومیت اور سادگی میں ایسی پُرکاری ہے کہ اگر وہ الفاظ اور استعاروں کے انتخاب میں کچھ اور محتاط ہو جائے تو اُس کی آواز اپنی ہم عصر شاعرات میں مزید واضح اور منفرد ہو جائے گی۔ وہ اس اعتبار سے بھی خوش قسمت ہے کہ اُسے ایک محبت کرنے والا سخن فہم اور سخن دوست شوہر ڈاکٹر محمد کامران کی شکل میں ملا ہے ورنہ عام طور پر خواتین لکھنے والیوں کے لئے رکاوٹوں کا سفر اُن کے اپنے گھر سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ صائمہ کامران ایک خوش گو اور خوش خیال شاعرہ ہے اور اُمید کی جاسکتی ہے کہ ہر اگلے شعری مجموعے کے ساتھ ساتھ اُس کا فنی قد بھی بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا۔

نام کتاب: آدھے نا شیر ہے......! / کالم نویس: عبداللہ طارق سہیل / صفحات 408 / قیمت: # روپے

ناشر: ایڈین بک ہاؤس، اُردو بازار لاہور

معاشروں میں اچھائی اور بُرائی کا ایک تناسب ہوتا ہے۔ اچھائی کچھ کم' بُرائی کچھ زیادہ۔ یہ توازن بگڑ جائے تو حالات معمول کے مطابق نہیں رہتے۔ توازن بگڑنے کا مطلب یہ نہیں لیا جاسکتا کہ اچھائی زیادہ ہوگئی ہے۔ اس کی نوبت تو شاید قیامت سے ذرا پہلے ہی آسکتی ہے۔ توازن بگڑنے کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ بُرائی زیادہ ہوگئی اور مشرف دور میں تو ہر طرح کی برائی کو ''قومی ملکیت'' یعنی سرکاری سرپرستی میں لے لیا گیا اور بگاڑ اتنا زیادہ ہوگیا کہ اچھائی دکھائی دینا ہی بند ہوگئی۔ سیلاب آنے پر سب زمین ڈوب جاتی ہے' لیکن زیادہ اُونچی جگہیں جزیرے کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ یہ ''تاریخ ساز موڑ'' بھی وقت نے دیکھا کہ پاکستان سے زیادہ غریب ملک بنگلہ دیش اور بھارت پاکستان سے زیادہ امیر ہوگئے۔ اداروں کا نظام درہم برہم ہوگیا لسانی اور مسلکی بنیادوں پر قتل عام ہونے لگے اور خونریزی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ پاکستان طویل خانہ جنگی سے تباہ ہونے والے افریقی ملکوں کے منظر پیش کرنے لگا۔ یہ کالم اسی دور کی جھلکیاں ہیں۔ لکھنے کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ ہر ناہموار پر انگلی اُٹھائی جائے اور ہر بُرائی کا تمسخر اڑایا جائے' یہ کالم اسی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ کہیں پر تنقید کے ہدف کا نام لیا گیا ہے تو کہیں نہیں لیا گیا لیکن ایسے انداز میں کہ پتہ چل جاتا ہے کہ ہدف کون ہے۔

نام کتاب: یاد کے کنارے / شاعر: توقیر احمد شریفی / صفحات 160 / قیمت: 500 روپے / فلیپ: اقبال راہی

ناشر: ماورا پبلشرز' اُردو بازار لاہور

توقیر احمد شریفی کی شاعری پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اندر کے شاعر کو بیدار رکھا ہے اور اسے نیند کی وادیوں کے سپرد نہیں کیا۔ ان کی تقریباً ساری شاعری ایسی ہے کہ اس کی نثر نہیں ہوسکتی اور یہ خوبی ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی۔ وہ جذبوں کی زبان بولتے بھی ہیں اور اسے سطحِ کاغذ پر بچھا بھی دیتے ہیں۔ ان کے لکھنے کا انداز اُڑتی ہوئی خوشنما تتلیوں کی طرح جاذب نظر ہے۔ وہ آنِ واحد میں اپنے تخیل کو شعروں کے پیرہن میں سمو دیتے ہیں۔ وہ روایت اور جدت کے سنگم پہ کھڑے ہوئے ایک ایسے شاعر ہیں جو شائستگی کی حدوں کے قریب ہو کر اپنے احساسات کی جوت جگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں اپنے لیے قبیلۂ شعراء میں اہم مقام بنالیا ہے۔

نام کتاب: سفر پر خوشبو نکل رہی ہے / شاعر: عیسیٰ بلوچ / صفحات 144 / قیمت: 300 روپے / دیباچہ: شاہ محمد مری

ناشر: نستعلیق مطبوعات، اُردو بازار لاہور

میں حیران ہُوا کہ اُس نے ہم بلوچوں کی صدیوں سے جاری اصناف میں دو چار مصرعے بھی نہ لکھے۔ نہ لیکو' نہ ڈیھی' نہ لیلوی نہ دستانغ' نہ لیلی مور' نہ موتک نہ لولی' نہ نازینک نہ زہیرونک...... ہر بلوچ شاعر' بالخصوص عیسیٰ جان سے میری فرمائش ہوگی کہ اپنی اُردو شاعری کا کم از کم ایک دو فیصد' بلوچی اصناف میں کریں۔ اُس کی شاعری بہت نکھر جائے گی۔

قلم اُٹھایا بلوچ تو سمجھو گل خان نصیر کا ماں جایا ہوتا ہے۔ اور گل خان کا فکری اور قلمی بھائی تو ہمارا مرشد اور سائیں ہوتا ہے۔ چوں کہ عیسیٰ جان کے ہاتھ میں قلم ہے اس لیے ہمیں احترام ہمیں تکریم۔ اور یہ قلم جب توکلی مست کی پیروی میں شاعری کرتا ہو تو ہم تو بن پوچھے اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں کہ بلوچ' مین سٹریم میں روشن فکر ہوتا ہے۔ وجودیت' جدیدیت' اُس کے بعد کی جدیدیت' ساختیات اور پس ساختیات کلاسیکل وقتوں سے لے کر آج تک بلوچی دانش میں کوئی جگہ کوئی گنجائش نہیں پاسکے۔ عیسیٰ بلوچ تو خیر سے تربیت ہی مین سٹریم ادب کی پاچکا ہے۔

نام کتاب: غالب کے بہتر خطوط/مرتب: ڈاکٹر انوار احمد/صفحات 160/ قیمت: 260 روپے/ارژنگ

---

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

---

ڈاکٹر انوار احمد کا نام علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ادبی حوالے سے اُن کی مرتب کردہ کتب گاہے بگاہے منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں جس سے قاری ہی نہیں بلکہ طلبا بھی مستفید ہوتے ہیں۔ غالب کے بہتر 72 خطوط اُن کی مرتب کردہ تازہ کتاب ہے۔ یوں تو غالب کے خطوط شائع ہو چکے ہیں لیکن زیرِ تبصرہ کتاب کی اشاعت کی وجہ اور اہمیت ان الفاظ میں ڈاکٹر صاحب خود بتاتے ہیں۔ ''بے شک غالب کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں' خاص طور پر مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر خلیق انجم کا مدوین لائق تحسین ہے۔ مگر مجھے خیال آیا کہ غالب 72 برس جیئے۔ اگر چہ اب میر کے بہتر 72 نشتروں کی بات تو فسانہ ہوئی تاہم ہم ان منتخب خطوں کو اُن کی عمر کی مناسبت سے 72 تک لے جا کر یا تو اس زمانے کی سفاک کربلا کے حوالے کر دیا جائے جہاں یزید اور زیاد نے بچوں کی درس گاہوں کے اندر بارودی سُرنگیں بچھا دی ہیں اور یا پھر اسے آنے والے وقت کے برقیاتی کتاب خانوں میں امانتاً رکھوا دیا جائے البتہ ایک کوفی نے مجھے بتایا ہے کہ ہجری تقویم کے اعتبار سے غالب کی عمر 73 برس بنتی ہے مگر 72 کی مناسبتیں کچھ ایسی ہیں کہ میں ایک اور خط شامل کر کے ان مناسبتوں کو قربان نہیں کرنا چاہتا۔''

اس کتاب میں ڈاکٹر انوار احمد کا مختصر پیش لفظ جس کی ایک جھلک ابھی آپ نے ملاحظہ کی اپنے اندر گہری معنویت اور فکر لیے ہوئے ہے۔ اس کے بعد کتاب کا حصہ جس میں مولانا غلام رسول مہر' ڈاکٹر خلیق انجم' ڈاکٹر مشیر احمد' کاظم علی خاں امتیاز علی عرشی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی سے خوشہ چینی کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے اور اُس کے مرتبین ڈاکٹر روبینہ رفیق' ڈاکٹر محمد آصف حماد رسول اور نازیہ راحت ہیں بہت علمی' معلوماتی اور تحقیقی کام ہے۔ 72 خطوط کا متن مع فرہنگ اس حوالے سے اہم ہے کہ قاری کو مشکل اور دقیق الفاظ کی کھوج میں لغت کا سہارا نہیں لینا پڑتا اور خطوط کو پڑھنے کا مزا بے ذائقہ نہیں ہوتا۔ یہ کتاب اپنے متن اور غالب کے 72 خطوط کے حوالے سے بہت اہم ہے۔

نام کتاب: بیس یادگار خاکے/مرتب: شازیہ یاسمین/صفحات 440/ قیمت: 660 روپے/ڈاکٹر انوار احمد

---

ناشر: بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

---

ہمارے ہاں صنفی امتیاز کو منفی معنوں میں ہی لیا جاتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ عورت کی آنکھوں کو مرد کے مقابلے میں زیادہ پُر کشش ہونا چاہیے۔ نسائی دل کی زیادہ دردمندی کی بات میں اس لیے نہیں کرتا کہ عموماً عورت کے دل میں پائی جانے والی رقت کے راستے ہی نقب لگائی جاتی ہے البتہ عورت کی یادداشت عموماً کینہ توز ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کسی بھی منظر یا واقعے کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو چاہے بھی تو بھلا نہیں سکتی خاص طور پر کوئی ایسا واقعہ جو زیادہ خوش گوار نہ ہو یا ایسے شخص سے ملاقات جس کی ریاکاری کو اُس نے وجدانی طور پر بوجھ لیا ہو۔ دوسری طرف ایک دُنیا عالموں کی ہے جو کہتے ہیں کہ تخلیق کاروں کے مابین صنفی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ شاید اسی تناظر میں کہا جاتا ہے کہ مرد لکھتے ہوئے عورت بن جاتی ہے اور عورت لکھتے ہوئے مرد بن جاتا ہے۔ شعبۂ اُردو بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی ایک ذہین طالب علم شازیہ یاسمین نے ایک معنی خیز موضوع کو تحقیق اور تنقید کے لیے منتخب کیا اور بیس ایسی شخصیتوں کے خاکوں کا انتخاب فکر انگیز مقدمے کے ساتھ پیش کر دیا ہے جس پر ایک مرد قلم کار نے طبع آزمائی کی اور کسی خاتون لکھک نے بھی قلم اُٹھایا۔ اب آپ فیصلہ کیجیے کہ نظر' زاویہ' یادداشت اور تاثرات کے اعتبار سے کون کون سا فرق معنی خیز ہے۔

# نامہ ہائے احباب

محترمی و محبی عامر بن علی مدیر اعلیٰ صاحب!

السلام علیکم۔ فیس بک کے ذریعہ رابطہ ہوا مسرت ہوئی۔ ارژنگ بھی نظر نواز نہ ہوا ایک وقت تھا جب اوراق سے لے کر صریر تک کے پاکستانی تمام رسائل میں میری تخلیقات تواتر کے ساتھ شائع ہوتی تھیں اور تمام رسائل بھی برابر ملتے رہتے تھے مگر ادھر ڈاک کی گرانی عرصہ حت کی گرانی نے دور کر دیا ہے پھر بھی کبھی کبھار دو ایک رسائل آتے رہتے ہیں۔

ارژنگ کے لئے ڈاکٹر اشفاق شاہین صاحب کا تبصرہ اپنا ایک مضمون بھی حاضر کر رہا ہوں غزلیں نظمیں رباعیات آپ کو مجموعہ میں مل جائیں گی جو پسند فرمائیے شامل فرمائیے۔

ازراہ عنایت ارژنگ کا تازہ شمارہ ضرور مرحمت فرمائیے۔ رسید و گرانقدر تاثرات کا منتظر رہوں گا پانچویں شعری مجموعے ''سفر تمام ہو گیا ہے'' کتابت کے آخری مراحل میں ہے اُس میں تمام مشاہیر کی آراء تاثرات مضامین کے ساتھ تازہ کلام بھی شامل ہوگا مجھے خوشی ہوگی آپ کے تاثرات بشکل مضمون کتاب میں شامل کروں۔ متعلقین و احباب کی خدمت میں واجبات۔

طلب دُعا

رئیس الدین رئیس/علی گڑھ۔ انڈیا

مُرقع حُسن پیارے حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ جولائی کا ارژنگ رمضانی کیف و کم کو باغ و بہار کر گیا۔ آپ نے اسے خوب سجایا نکھارا ہے۔ نوع بہ نوع لکھائیاں دل کو لگیں۔ مضمون ''محمد اظہار الحق کی شاعری'' بہت پسند آیا۔ منشا یاد مرحوم نے دوستی کا حق ادا کیا۔ مضمون پرانا ہے مگر تازگی بدستور ہے۔ آپ جانیں محمد اظہار الحق طرفگیٔ اسلوب میں اسم رکھتے ہیں۔

ان کے شعری اظہارات منفرد اور دل افروز ہیں۔ میں آپ کو خط لکھتا ہوں پہنچا نہیں۔ بوئی ہزارے کا دور کا گوشہ ہے اور کوئی سہولت میڈیا کی نہیں ایک پوسٹ آفس کے سوا۔ اس سہولت میں بھی گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔ خط وغیرہ ''گم کردہ راہ'' کا مضمون ہو جاتے ہیں۔ صد شکر کہ ارژنگ ''منزل'' پالیتا ہوں۔ منزل بھی کیا ہے۔ ایک بھولا بسرا فقیر آپ کی عنایت ہے جو آپ ادھر دیکھ لیتے ہیں۔

آپ کی شاعری بھی جانفزا ادائیں بھی جان نواز۔ خدا خیریت ہی رکھے۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ جولائی 2015ء کا ارژنگ نئی آب و تاب کے ساتھ نظر افروز ہوا' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہر بار نئی آب و تاب میں معتد بہ اضافوں کے ساتھ دل کو اچھا لگا اور اعلیٰ اور معیاری اَدب اشراح کے مطالعے سے انشراح کا باعث ہوا۔ آپ کی ''سائیں'' سے ماخوذ حمد نے حظ آفریں لطافتوں اور حمد شناسی کی دلآویز اقدار کو نہایت طمانیت بخشی۔ ماشاء اللہ زورِ بیان اور حمد کی آفاقی اقدار سے ہم آہنگ لیکن عصری جدتوں سے مالا مال اشعار نے بڑا محظوظ کیا۔ اس حمد سے مطالعہ کے بعد انتظار کو مہمیز لگی کہ مکمل مجموعہ ''سائیں'' جلد منصۂ شہود پر اُبھر آئے۔

توکلی مست پر جناب عاشق رحیل کا معلوماتی مضمون نہایت نافع ہوا۔ میں پھر ملتمس ہوں کہ آپ حرفِ اول کے عنوان سے ''ارژنگ'' کا افتتاحیہ قلم بند کیا کریں۔ آپ کی ادب عالیہ پر گہری نظر سے مزید استفادوں کی تہیں کھلنی چاہیں۔

سید ریاض حسین زیدی۔ ساہیوال

عزیزم حسن! اسلام مسنون

برسوں قرنوں ہوئے نہ تم ملے نہ ارژنگ۔ بس یونہی بیٹھے بیٹھے جی چاہا تمھیں ایک غزل بھیج رہی ہوں۔ بہت سی دُعائیں۔

تسنیم کوثر

جناب حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ بہت عرصے سے رسالے نہیں ملے۔ آپ سے کافی دفعہ بات تو ہوتی ہے اُمید ہے۔ مل جائیں گے۔

پھر بھی خط لکھنے کا اِک تسلسل تو رہنا چاہیے۔ واہ کینٹ سے تعلق رکھنے والے معروف نوجوان شاعر۔ شمشیر حیدر کی شاعری پر اِک چھوٹا سا مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ اسے جگہ مل جائے تو خوشی ہوگی۔ آپ ویسے بھی نئی آوازوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ایک غزل بھی پیشِ خدمت ہے۔

سلامت رہیں

آستھ کنول/ لاہور

---

برادرم حسن عباسی جی!

اسلام علیکم! اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔ 8 اگست کو وادیٔ ادب کی اشاعت کے سلسلہ میں لاہور آیا تو اپنے دوست محسن جناب شاہد عباسی سے ملاقات کی۔ اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارا آتے ہوئے انہوں نے ''ارژنگ'' عطا کیا۔ جاذبِ نظر ٹائٹل اور معیاری مواد نے متاثر کیا۔ آپ کا کام سراہا جانا چاہیے۔ اس دور میں ادبی کام کتنا مشکل ہے۔ اس کا تھوڑا سا تجربہ مجھے ہے۔'' مولا خوش رکھے بھاگ لگے رہین'' غزل ارسال کر رہا ہوں قبول کریں۔ لاہور آنے پر ملاقات ہوگی۔

آپ کا امجد شریف ایڈیٹر وادیٔ ادب

---

کویت میں مقیم نظم وغزل کے ممتاز شاعر

**عیسیٰ بلوچ**

کا شعری مجموعہ

**"خوشبو سفر پر نکل رہی ہے"**

چھپ کر قارئین سے داد وتحسین پا چکا ہے۔

صفحات 144 ' قیمت 250 روپے

ناشر: نستعلیق مطبوعات غزنی سٹریٹ

اُردو بازار لاہور

---

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ'' ملا ہر اک صفحہ معیار اور جدت کی عکاسی کر رہا تھا جو کہ آپ کے ادبی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں آپ کا مشکور ہوں جو اس ادبی رسالے سے نوازتے ہیں، کسی دن مکمل تبصرہ لکھ کر بھیجوں گا۔ ابرار اور دوسرے دوستوں کو سلام کہیے گا۔ اب کے بار کچھ تازہ شاعری اور میری کتاب پر پروفیسر سکندر عباسی کی تحریر ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید رکھتا ہوں کہ آپ ارژنگ کے معیار پر پورے اُتریں گے۔

آپ کا اپنا

عابد کاظمی/ لاڑکانہ

---

## کون مرا ہے؟

سڑک کنارے
خون میں لت پت
ٹکڑے ٹکڑے
جسم پڑا ہے
یاس میں ڈوبی
آخری ہچکی
بجھتے بجھتے حیراں آنکھیں
گھور رہی ہیں
ہر اک چہرہ
پاس کھڑا میں حیرت میں گم
دیکھ رہا ہوں
سوچ رہا ہوں
کوئی بتلائے لاش ہے کس کی
کون مرا ہے؟؟؟؟

بدر سیماب

---

﴿ حمدیہ نعتیہ مجموعہ ﴾

**ابارِیق طهوره**

ننکانہ صاحب میں مقیم مترنم شاعر عبدالرؤف نبی پوری کا اولین شعری مجموعہ چھپ کر مارکیٹ میں آگیا ہے۔

صفحات: 144

قیمت: 300 روپے

ناشر: نستعلیق مطبوعات غزنی سٹریٹ

اُردو بازار لاہور

## ممتاز شاعر اور سفرنامہ نگار
# حسن عباسی
## کا پہلا حمدیہ شعری مجموعہ
# سائیں
## شائع ہو گیا ہے

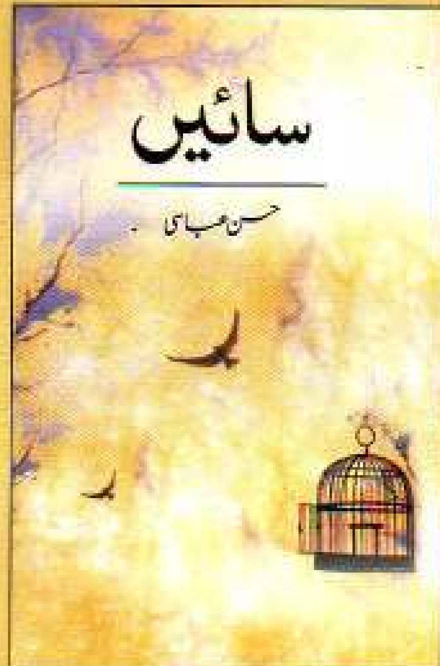


اپنی بھگت گزاریاں سائیاں
تیری سب ڈیرہ داریاں سائیں

•

دیکھ کے تیرے جلوے سائیں
میں واری میں صدقے سائیں

•

تیری جھلک کیا دیکھی سائیں
اپنی ہو گئی نچلی سائیں

•

میں ہوں کچا کوٹھا سائیں
مار کسی دن پوچھا سائیں

•

جس کی تجھ تک رسائیاں سائیں
ہیں اسی کی کمائیاں سائیں

حسن نے میرے اور آپ کے رب کو جس نظریے سے دیکھا ہے اور اس حوالے سے جو شاعری کی ہے وہ حمدیہ روایت سے مکمل طور پر ہٹ کر ہے۔ حسن کا خدا بھی اس کے محبوب کی طرح میرے اور آپ کے محبوب سے جدا ہے۔ یہ حمد پڑھتے ہوئے بھی میں بیک وقت ایک روحانی اور رومانی تجربے سے گزرا۔ یہ ایک عجیب نظم ہے اور مجھے یقین ہے حسن کو یہ نظم دونوں جہانوں میں زندہ رکھے گی۔

عطاء الحق قاسمی

---

حسن عباسی نے "سائیں" میں متضاد کیفیات کی نازک پچی کاری سے حمد کا ایک ایسا بے مثل موزیک ترتیب دیا ہے...... کہیں عجز کی پاس داری کا رنگ ہے تو کہیں انا کی آب داری کی رمک۔ کہیں گریز، احتیاط اور حزن کی گرانباری ہے تو کہیں تجاوز، اصرار اور بے ساختگی کی تیز گفتاری اور یہ سب کچھ یک جان ہو کر ایک ایسے لہجے کی نمود کی اساس بن گیا ہے، جس کی کوئی مثال شاید اردو کی حمدیہ شاعری میں اس سے پہلے موجود نہیں۔

غلام حسین ساجد

---

حسن عباسی کا حمدیہ دیوان "سائیں" ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کرتا ہے۔ یہاں نقاشِ ازل کے روبرو ہونے کی سچی سسکی ملتی ہے اور خدا سے تخاطب بندگانہ اُس پہلودار پارۂ الماس کی طرح لو دیتا ہے جس میں مختلف اور متضاد رنگوں کی چھوٹ ایک دوسرے پر پڑتی ہے اور ایک ایسے آئینہ خانہ میں لے جاتی ہے جہاں شاعر کا وفورِ احساس قاری میں سرایت کرنے لگتا ہے۔ ان نوبہ نو رنگوں میں کہیں بے مائیگی کا احساس ہے کہیں نارسائی کی کسک، کہیں عجزِ ادراک کی جھلک ہے اور کہیں شرفِ انسانی کا وہ تفاخر جس میں چھوٹے منہ سے بڑی بات بھی نازیبا معلوم نہیں ہوتی۔ گستاخی و بے باکی میں محبت کی رمزیں جھلکنے لگتی ہیں اور حسنِ ادا سے شکوہ، شکر میں ڈھل جاتا ہے۔

خورشید رضوی

---

حسن عباسی کا تازہ مجموعہ کلام ایک نادر حمدیہ شعری اظہار ہے جس نے مجھے ایک حیرت انگیز سرخوشی سے معمور کر دیا...... ایک والہانہ پن ہے جو حسن عباسی کے حمدیہ اشعار میں بے ساختگی کے ساتھ پھلتا پھولتا آگے کی جانب اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے...... حسن عباسی حمد گزاری کے اس عمل میں خود بھی ایک نئی لذتِ اظہار سے آشنا ہوئے اور وہ اپنے قارئین کو بھی مزاج آشنا بنانا چاہتے ہیں۔ میں حسن عباسی کو اس کے اس بیش قیمت حمدیہ مجموعے پر مبارک باد دیتے ہوئے نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتا ہوں۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

---

حسن عباسی نے ایسی ڈھلی ڈھلائی اجلی لفظیات استعمال کیں کہ پڑھتے ہوئے کورے برتن کی سوندھی سوندھی خوشبو دماغ تک جاتی محسوس ہی نہیں ہوتی نظر بھی آتی ہے۔ ڈاریاں، منگو مہار، سانجھے داریاں، دوکیاں، اچھلے، جھوک، جھکی، کچا کوٹھا، پوچھا، پہاڑا، بوکا، کوٹھی، چھائیاں اور ایسے بے حد نئے نویلے، نکھرے نکھرے، سوہنے، چمکدار لفظ کہ دل میں اترتے جائیں اور اردو کے قرطاس پر کنوارے ان چھوئے پھول ٹانکتے جائیں۔ غالباً سہیل احمد خان نے پہلی بارش کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی شاعری زندگی کے متنوع تجربوں سے چھلک رہی ہے۔ یہ قول "سائیں" پر بھی صادق آتا ہے۔

محمد اظہار الحق

ناشر
نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 042-37351963
nastalique786@gmail.com

# لاہور ادبی فورم کے زیر اہتمام

## عامر بن علی کے اعزاز میں عشائیہ

ممتاز شاعر، کالم نویس، مترجم اور ماہنامہ ارژنگ کے مدیر اعلیٰ عامر بن علی گزشتہ دنوں پاکستان آئے تو ان کے اعزاز میں لاہور ادبی فورم نے ایک عشائیے کا اہتمام کیا جس میں ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ حسن عباسی نے عامر بن علی کی فن و شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ لاہور ادبی فورم کے چیئرمین افتخار شوکت نے فورم کا مختصر تعارف پیش کیا اور عامر بن علی کو پھول اور کتب کے تحائف پیش کیے۔ اس کے بعد مختصر شعری نشست میں افتخار شوکت، ناز اوکاڑوی، فاطمہ احمد، حسن عباسی، علی رضا، عمرانہ مشتاق، ممتاز راشد لاہوری، خالد شریف اور غلام حسین ساجد نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں عامر بن علی نے اپنا کلام سنایا۔ اس موقع پر ندیم بھٹی (ایڈووکیٹ) نے بھی ادب کے حوالے سے گفتگو کی اور مہمان شعراء کی ادبی کاوشوں کو سراہا۔ تقریب کے بعد پر تکلف ڈنر کا اہتمام کیا گیا۔

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com

Design By: MUHAMMAD AHSUN Gull